www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

October 2006 • No. 359

وقت کے استعمال کا بجٹ بنایئے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 24356666, 24355454
Fax: 24357333
website: www.alrisala.org
email: info@goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 100,
Two years Rs. 200,
Three years Rs. 300,
Five years Rs. 480
Abroad: One year $10 (Air Mail)

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

اکتوبر 2006

فہرست

روزے کی حکمت 2
نماز، قرآن میں 3
دعوت اور داعی 5
اخلاق، محفوظ انسانی سفر کا ضامن 7
آئی ڈنٹٹی کی تلاش 11
لائف بیانڈ لائف 15
ڈائلاگ اسلام میں 18
توہماتی دَور سے سائنسی دَور تک 23
نئی منصوبہ بندی کی ضرورت 26
مسلم ایمپاورمنٹ، یا سیلف ایمپاورمنٹ 30
قیادت ناکام، مسلمان کامیاب..... 33
عارضی دورِ حیات، ابدی دورِ حیات... 37
نعمت نہ کہ زحمت 38
دانش مند باپ 39
دعوت کی تاریخ 40
سی پی ایس انٹرنیشنل 42

روزے کی حکمت

اسلام میں دو عبادت کو بنیادی عبادت کا درجہ دیا گیا ہے — نماز، اور روزہ۔ نماز علامتی طور پر اسلام کے مثبت احکام کو بتاتی ہے۔ اور روزہ بتاتا ہے کہ اہلِ ایمان کو کچھ باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ نماز عمل کی زبان میں یہ بتاتی ہے کہ اہلِ ایمان کے اندر تواضع، اطاعت، شکر، امن پسندی اور باہمی الفت کا مزاج ہونا چاہیے۔ اس کے مقابلے میں روزہ یہ بتاتا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کی زندگی پرہیزگاری کی زندگی ہو۔

حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی شخص روزہ رکھے تو وہ نہ گندی بات کرے اور نہ شور کرے۔ اگر کوئی شخص اس کو گالی دے تو وہ یہ کہہ دے کہ میں روزے دار ہوں۔

اِس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ سیلف کنٹرول کی تربیت ہے۔ آدمی روزے کے زمانے میں جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں سیلف کنٹرول کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اسی طرح اس کو اپنی پوری زندگی میں اخلاقی کنٹرول کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ کوئی شخص اگر اپنے غلط رویّے سے اس کو بھڑکائے تب بھی اس کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو بھڑکنے سے بچائے۔

اِسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص نے روزہ رکھا مگر اس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں کھانا اور پانی چھوڑنا ایک علامتی ترک ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آدمی ہر بُرائی کے معاملے میں ''روزے دار'' بن جائے۔ وہ غلط بات بولنا بھی چھوڑ دے، اور غلط کام کرنا بھی چھوڑ دے۔ یہی روزے کا اصل مقصد ہے۔

رمضان کا مہینہ ذاتی محاسبہ کا مہینہ ہے۔ یہ اپنے اوپر نظر ثانی کرنے کا مہینہ ہے۔ یہ اپنی اصلاح آپ کرنے کا مہینہ ہے۔ رمضان کے مہینے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کی نظر سے دیکھے نہ کہ صرف اپنی نظر سے۔

نماز، قرآن میں

قرآن کی سورہ نمبر ۲۹ میں بتایا گیا ہے کہ: إنّ الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء و المنکر (العنکبوت: ۴۵) یعنی بے شک نماز فحش اور منکر باتوں سے روکتی ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص نماز کے فارم کو دہرائے تو خود بخود اس کا یہ عملی نتیجہ ہوگا کہ وہ بُری باتوں اور بُرے کاموں سے رُک جائے گا۔ اگر ایسا ہوتا تو فارم والی نماز پڑھنے والے کروروں لوگ ہر بُری بات اور ہر بُرے کام سے رُکنے والے دکھائی دیتے۔ حالاں کہ ایسا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اِس آیت میں نماز سے مراد نماز کی اسپرٹ ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی انسان کے اندر نماز والی اسپرٹ پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے اندر بُرائیوں سے بچنے کا مزاج پیدا ہوجاتا ہے۔ نفسیاتِ نماز اس کے لیے فحش اور منکر سے ناہی (restrict) کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ نماز دراصل ایک تربیت ہے نہ کہ صرف ایک رسم۔ آیت میں دراصل تربیت یافتگانِ نماز کا ذکر ہے نہ کہ صرف رسمی طور پر فارم کو ادا کرنے والوں کا ذکر۔

اِس کا مطلب یہ نہیں کہ فارم کوئی غیر اہم چیز ہے۔ اصل یہ ہے کہ فارم داخلی اسپرٹ کا ایک خارجی ظہور ہے۔ جہاں اسپرٹ ہوگی وہاں یہ خارجی ظہور بھی یقیناً پایا جائے گا۔ اِس معاملے کو اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ نماز کا فارم، نماز کی اسپرٹ کا ظہور یا اسپرٹ اِن ایکشن (spirit in action) ہے۔

ہر عبادتی فارم کا معاملہ یہی ہے۔ اگرچہ عبادت میں اصل اہمیت اسپرٹ کی ہے، لیکن اسپرٹ جب زندہ ہو تو فطری طور پر وہ حرکت و عمل (activities) کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ نماز کے لیے آدمی جب وقت پر اٹھتا ہے، وہ وضو کرتا ہے، وہ مسجد جاتا ہے، وہ لوگوں کے ساتھ باجماعت نماز میں شریک ہوتا ہے اور پھر لوگوں سے مل کر وہ واپس آتا ہے، اور پھر یہی کام وہ روزانہ پانچ بار کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز کی عبادت، حرکت و عمل میں (activities) بدل جاتی ہے۔ اسپرٹ کے بغیر حرکت و عمل نہیں، اور حرکت و عمل کے بغیر اسپرٹ نہیں۔

اسپرٹ اِن ایکشن کے معاملے کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مختلف ملکوں میں قومی دن منائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندستان میں ۱۵/اگست کو یوم آزادی، ۲۶ جنوری کو یومِ جمہوریہ وغیرہ۔ بظاہر یہ کچھ رسمی تقریبات (celeberation) منانے کا دن ہوتا ہے۔ مگر ان کی اہمیت صرف اِن ظاہری تقریبات کی بنا پر نہیں بلکہ اُس داخلی اسپرٹ کی بنا پر ہوتی ہے، جس کے تحت ان کو منایا جاتا ہے۔

یہ داخلی اسپرٹ کیا ہے۔ یہ داخلی اسپرٹ حبُّ الوطنی ہے۔ یعنی وطن سے اپنے تعلق کو یاد کرنے کے لیے کچھ تاریخی دنوں میں بعض تقریبات منانا۔ اِس اعتبار سے ہندستان کے یومِ آزادی یا یومِ جمہوریہ کو حبّ الوطنی کا عمل (patriotis in action) کہا جاسکتا ہے۔

یہ معاملہ زندگی کی ہر سرگرمی سے تعلق رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کا ایک دوست لمبے عرصے کے بعد آپ کے پاس آتا ہے اور آپ سے ملاقات کرتا ہے۔ دوست کو دیکھ کر آپ کے اندر محبت کا جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ آپ اٹھ کر اس سے ملیں گے۔ اس سے معانقہ کریں گے۔ اس کو لے جا کر عزت کے ساتھ بٹھائیں گے۔ ٹیلی فون کے ذریعے دوسروں کو بتائیں گے کہ آپ کا فلاں دوست آیا ہوا ہے۔ اس کے لیے کھانے پینے اور آرام کرنے کا اہتمام کریں گے، وغیرہ۔

محبوب دوست کے لیے آپ کی یہ تمام سرگرمیاں عملاً محبت (love in action) کا مصداق ہیں۔ آپ کی ظاہری سرگرمیاں گویا کہ داخلی محبت کا خارجی ظہور ہیں۔ محبت اگرچہ اصلاً ایک داخلی حالت کا نام ہے، لیکن مذکورہ سرگرمیاں بھی اس کا لازمی جُز ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا — اِن مثالوں سے عبادت کی روح اور اس کے فارم کے باہمی تعلق کو سمجھا جاسکتا ہے۔

دعوت اور داعی

قرآن اور حدیث میں دعوت کے لیے دوسرا لفظ جو استعمال ہوا ہے وہ شہادت ہے۔ اِسی طرح داعی اور مدعو کے لیے جو دوسرے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ شاہد اور مشہود کے الفاظ ہیں۔ یہ بات بہت بامعنیٰ ہے۔ اس پر غور کرنے سے ایک نہایت اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔

شاہد کا مطلب گواہ (witness) ہے۔ گواہ کون ہے۔ گواہ سے مراد وہ شخص ہے جس نے زیرِ بحث واقعہ کو دیکھا ہو، یا کسی چیز کے بارے میں وہ ابتدائی معلومات دے سکے:

Witness: a person who saw, or can give a first-hand account of something.

دعوت سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلموں میں حق کا پیغام پہنچایا جائے۔ جب مسلمانوں کو ان کی یہ دعوتی ذمے داری یاد دلائی جائے تو کہا جاتا ہے کہ اِس سلسلے میں پہلا کام خود مسلمانوں کی اصطلاح ہے۔ یعنی مسلم سماج اور مسلم ریاست کو صحیح اسلامی اصول پر قائم کرنا۔ کیوں کہ اگر مسلمان خود ہی بگڑے ہوئے ہوں اور اُن کے درمیان صالح معاشرہ اور صالح نظامِ حکومت قائم نہ ہو تو غیر مسلموں کو کس طرح اسلام کی طرف بلایا جاسکتا ہے۔

یہ ایک غیر متعلق (irrelevant) بات ہے۔ کیوں کہ اسلامی دعوت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو مسلم سماج کی طرف بلایا جائے۔ اسلامی دعوت کا مقصد لوگوں کو مسلمانوں کی طرف بلانا نہیں بلکہ اسلام کی طرف بلانا ہے۔ لوگوں کو یہ بتانا کہ ان کا ایک خدا ہے۔ لوگوں کو خدا کے کریشن پلان سے آگاہ کرنا، لوگوں کو جنت اور جہنم کی خبر دینا، لوگوں کو یہ بتانا کہ خدا ایک دن تم کو جمع کرے گا اور تمھارا حساب لے گا، اور پھر لوگوں کے لیے ان کے ریکارڈ کے مطابق، جنت یا جہنم کا فیصلہ کرے گا۔

گویا کہ دعوت کا نشانہ یہ ہے کہ جو لوگ دکھائی دینے والی دنیا (seen world) میں جیتے ہیں، ان کو یہ بتانا کہ یہاں ایک نہ دکھائی دینے والی دنیا (unseen world) موجود ہے، اور تم کو آخر کار

مرنے کے بعد اسی نہ دکھائی دینے والی ابدی دنیا کی طرف جانا ہے، اور اس کے تقاضوں کا سامنا کرنا ہے۔

اِس اعتبار سے دیکھیے تو دعوت کے عمل میں مسلمانوں کے معاشرے یا نظام کا صالح ہونا یا غیر صالح ہونا ایک غیر متعلق بات ہے۔ اِس معاملے میں اصل اہمیت صرف دو چیزوں کی ہے — استدلال اور یقین۔ ایک، یہ کہ داعی کے پاس ایسی دلیل کا سرمایہ موجود ہو جو مدعو کو مطمئن کر سکے۔ دوسری بات یہ کہ داعی کو خود سچائی کی اتنی گہری معرفت حاصل ہو کہ وہ پورے یقین کے ساتھ اس کی طرف دعوت دے سکے۔ اس کا یقین اتنا بڑھا ہوا ہو کہ جب وہ اس کے بارے میں بولے تو ایسا محسوس ہو کہ وہ لوگوں کو کسی ایسی چیز سے باخبر کر رہا ہے جس کو اس نے خود دیکھا ہے۔

داعی جب دوسروں کے درمیان دعوت کا کام کرتا ہے تو اُس وقت نکتۂ دعوت کیا ہوتا ہے۔ اُس وقت اس کا نکتۂ دعوت یہ نہیں ہوتا کہ ہم نے اپنے یہاں ایک صالح نظامِ زندگی بنا لیا ہے، تم اس کو دیکھو اور تم بھی ویسا ہی نظام اپنے یہاں بناؤ۔ داعی کا دعوتی نکتہ یہ نہیں ہوتا۔ داعی کا دعوتی نکتہ صرف یہ ہوتا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان کیا تعلق ہے، اور دعوت کے بعد کی زندگی میں انسان کے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ اسی کو قرآن میں انذار اور تبشیر کہا گیا ہے۔ گویا کہ اسلام میں نکتۂ دعوت اس کا نظری پہلو ہے نہ کہ اس کا نظامی پہلو۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت اِسی دعوتی نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہے۔

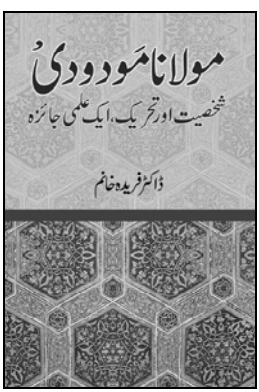

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اسلامی انقلاب کی تحریک بیسویں صدی کے نصف اول میں شروع ہوئی اور صدی کے آخر تک پورے بر صغیر ہند میں پھیل گئی۔ علماء اسلام کی طرف سے اس تحریک پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے ردّعمل سامنے آئے۔ زیر نظر کتاب میں اس تحریک کا اور اس کے بانی کی شخصیت کا علمی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب ایک جامع مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخلاق، محفوظ انسانی سفر کا ضامن

انسانی سماج کو ایک بہتر سماج بنانے کے لیے جو تعمیری اصول ہیں، انھیں اصولوں کو اخلاقی اقدار (moral values) کہا جاتا ہے۔ اِن اخلاقی اقدار کو اختیار کرنے سے انسانی سماج بہتر سماج بنتا ہے، اور ان کو چھوڑنے سے انسانی سماج برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ سماج کو اگر ٹرین سے تشبیہ دی جائے تو اخلاقی اقدار گویا ریل کی وہ پٹریاں ہیں جن کے اوپر سماجی ٹرین بھٹکے بغیر اپنا سفر کامیابی کے ساتھ طے کرتی ہے۔

یہ اخلاقی اقدار بنیادی طور پر یہ ہیں — امن، انصاف، محبت، سچائی، رواداری، خیر خواہی، عدم تشدد، صبر تواضع، عالمی اخوت اور اخلاقی سلوک، وغیرہ۔ یہ اخلاقی اقدار اتنی زیادہ مسلّم ہیں کہ تمام مذہبی اور روحانی نظاموں میں یکساں طور پر ان کی خصوصی تعلیم دی گئی ہے، اور ان کو انسانی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اقدار کا یہی مجموعہ ہے جس کو اخلاق کہا جاتا ہے۔ یہی اخلاقی اصول انسان کے اندر اعلیٰ شخصیت بناتے ہیں۔ انھیں اخلاقی اصولوں کی پیروی سے کوئی سماج بہتر سماج بنتا ہے۔ انھیں اخلاقی اصولوں کی پیروی سے وہ سماجی مقاصد حاصل ہوتے ہیں، جن کو ہم انسانیت کی فلاح کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

خدا نے اِن اقدار کو انسان کی فطرت میں اخلاقی حِس (moral sense) کے طور پر ودیعت کر دیا ہے۔ ہر انسان اِن اخلاقی اصولوں کا شعور پیدائشی طور پر رکھتا ہے۔ تمام مذہبی اور روحانی نظام اِس کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ خدا نے کائنات کو اِس طرح بنایا ہے کہ وہ انسان کے لیے گویا ایک اخلاقی ماڈل بن گئی ہیں۔ جو چیز انسان کو خود اپنے ارادے کے تحت، عمل میں لانا ہے وہ چیز بقیہ کائنات میں خدا کے براہِ راست کنٹرول کے تحت زیرِ عمل آ رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان اور کائنات دونوں کا اخلاقی نظام ایک ہے۔ بقیہ کائنات میں اس کا

نام قانونِ فطرت (law of nature) ہے، اور انسانی دنیا میں اس کو اخلاقی اقدار (moral values) کہا جاتا ہے۔

انسان اور کائنات دونوں کو ایک خدا نے پیدا کیا ہے۔ دونوں کی کارکردگی کے لیے اس نے ایک ہی قانون مقرر کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بقیہ کائنات میں یہ قانون براہِ راست طور پر خود خدا نے نافذ کر رکھا ہے۔ لیکن انسان کو خدا نے یہ عزت دی ہے کہ اس کو آزاد اور خود مختار بنایا ہے۔ بہتر انسانی سماج بنانے کا راز یہ ہے کہ انسان اسی خدائی قانون کو خود اپنے ارادے سے اپنی زندگی میں نافذ کرے۔

خلا میں اَن گنت ستارے ہیں۔ ہر ایک نہایت تیزی کے ساتھ وسیع خلا میں گردش کر رہا ہے۔ لیکن ان کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اِس کا راز یہ ہے کہ ہر ستارہ اور سیارہ اپنے اپنے مقرر مدار (orbit) پر گردش کرتا ہے۔ کوئی ستارہ دوسرے ستارے کے مدار میں داخل نہیں ہوتا۔ گردش کا یہ انضباطی اصول، ستاروں کے درمیان ٹکراؤ ہونے نہیں دیتا۔ یہی اصول، انسان کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو اپنے دائرے کے اندر محدود رکھے۔ اس کے بعد انسانی سماج میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ یہی فارمولا پیس فُل سماجی تعلقات کا واحد فارمولا ہے۔

ہوائیں چلتی ہیں تو وہ نہایت تیزی کے ساتھ میدان سے گذرتی ہیں۔ یہاں سرسبز پودے ہوتے ہیں۔ یہ پودے ہواؤں کے طوفان میں نہیں ٹوٹتے۔ اس کا سبب یہ ہے وہ ہوا کے مقابلے میں کبھی نہیں اکڑتے۔ جب ہوا کا جھونکا آتا ہے تو پودا فوراً جھک کر ہوا کو گذرنے کا موقع دے دیتا ہے۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ سماجی زندگی میں اکڑ کے بجائے سمجھوتہ اور ایڈجسٹ مینٹ کا طریقہ اختیار کرے۔

پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے اور اس سے چشمے جاری ہو جاتے ہیں۔ چشمے کے راستے میں بار بار پتھر آتے ہیں مگر چشمہ ایسا نہیں کرتا کہ پہلے وہ پتھر کو اپنے راستے سے ہٹائے اور پھر اس کے بعد اپنا سفر جاری کرے۔ بلکہ وہ مُڑ کر پتھر کے کنارے کی طرف سے اپنا راستہ بنا لیتا ہے، اور آگے کی طرف رواں

ہوجاتا ہے۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ٹکراؤ کو اوائڈ کرکے اپنا راستہ بنائے۔ نہ کہ وہ رُکاوٹ سے ٹکراؤ شروع کردے۔

درخت انسان کے لیے آکسیجن نکالتا ہے، اور ہوا اس کو لے کر اُسے انسان تک پہنچاتی ہے۔ لیکن درخت اور ہوا اپنے اس عمل کے لیے انسان سے اس کی کوئی قیمت نہیں مانگتے۔ ایسا ہی انسان کو کرنا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنے۔ اور اپنے اس عمل کے لیے لوگوں سے کسی قیمت کا تقاضا نہ کرے۔

گائے خدا کی ایک زندہ انڈسٹری ہے۔ گائے کو اس کا مالک گھاس کھلاتا ہے، لیکن گائے اس کے بدلے میں اپنے مالک کو دودھ لوٹاتی ہے۔ وہ دوسروں سے غیر دودھ (non-milk) کو لیتی ہے اور پھر ان کو اپنی طرف سے دودھ (milk) کا تحفہ واپس کرتی ہے۔ اسی طرح انسان کو چاہیے کہ جب بھی اس کو کسی سے منفی تجربہ ہو تو اس کے جواب میں وہ اس کے ساتھ مثبت سلوک کی روش اختیار کرے۔

کسی مقام پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہوں اور وہ زمین پر پڑے ہوئے دانے چُگ کر خوش خوش اس کو کھا رہی ہوں۔ ایسی حالت میں آپ ان کی طرف ایک کنکر پھینک دیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ چڑیاں اُڑ کر درخت کی شاخ پر پہنچ گئیں، اور دوبارہ وہاں چہچہانے لگیں۔ نفرت اور شکایت جیسی چیز کسی چڑیاں کے دل میں کبھی جگہ نہیں پاتی۔ یہی طریقہ انسان کا ہونا چاہیے۔ انسان کو بھی ایسا بننا چاہیے کہ جب کوئی شخص اس کو ستائے یا اس کو کوئی نقصان پہنچائے تو وہ نفرت اور شکایت کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ وہ منفی حالات کے باوجود اپنے آپ کو مثبت نفسیات پر قائم رکھے۔

دنیا کی تمام چیزیں قابلِ پیشین گوئی کردار (predictable character) کی حامل ہیں۔ اِس مادّی دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اِس معاملے میں استثناء کی حیثیت رکھتی ہو۔ مثلاً ستارے ہمیشہ اپنی مقرر رفتار پر پوری حتمیت کے ساتھ قائم رہتے ہیں۔ ببول کے بیج سے ہمیشہ ببول کا درخت نکلتا ہے اور انگور کے بیج سے ہمیشہ انگور کا درخت، وغیرہ۔ یہی کردار انسان کا بھی ہونا چاہیے۔ انسان کو بھی اس طرح قابلِ پیشین گوئی عمل کے معیار پر پورا اترنا چاہیے۔ قابلِ پیشین گوئی کردار یہ ہے کہ کسی

صورتِ حال میں ایک حقیقی انسان سے جو امید کی جائے، وہ ہمیشہ اُس پر پورا اُترے۔

سورج مسلسل طور پر روشنی اور حرارت سپلائی کرتا ہے۔ اِس معاملے میں وہ اپنے اور غیر کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا۔ وہ سب کو یکساں طور پر روشنی اور حرارت کا خزانہ پہنچاتا رہتا ہے۔ یہی کردار انسان کا بھی ہونا چاہیے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ ہر یک کے لیے نفع بخش بنے۔ اپنوں کے لیے بھی اور غیروں کے لیے بھی۔ دوستوں کے لیے بھی اور دشمنوں کے لیے بھی۔ خوش گوار تعلق والوں کے لیے بھی اور ناخوش گوار تعلق والوں کے لیے بھی۔ یہی کسی انسان کے لیے اعلیٰ معیاری اخلاق ہے۔

شہد کی مکھی اپنے مقام سے اُڑ کر جنگل میں جاتی ہے۔ یہاں بہت سی مختلف قسم کی چیزیں ہیں۔ مثلاً لکڑی، کانٹا، جھاڑی اور گھاس، وغیرہ۔ لیکن شہد کی مکھی انتخابی طریقہ اختیار کرتی ہے۔ وہ ہر دوسری چیز سے اعراض کر کے سیدھے اُس پھول تک پہنچتی ہے جہاں سے اس کو میٹھا رس لینا ہے۔ یہی انتخابی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا چاہیے۔ اس کو سماج میں اِس طرح رہنا چاہیے کہ وہ غیر مطلوب چیزوں سے اعراض کر کے۔ وہ ہر ناپسندیدہ چیز سے دور رہتے ہوئے اپنے مطلوب تک پہنچ جائے۔

انسان اور بقیہ کائنات میں ایک فرق ہے۔ وہ یہ کہ بقیہ کائنات نے جس کردار کو مجبورانہ طور پر اختیار کر رکھا ہے، اُسی کردار کو انسان خود اپنی آزادی کے تحت اختیار کرے۔

بقیہ کائنات مجبورانہ اخلاق کی مثال ہے۔ مگر انسان کو اختیارانہ کردار کا نمونہ بننا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ بقیہ کائنات کے لیے نہ کوئی انعام ہے اور نہ کوئی سزا۔ لیکن انسان کے لیے خدا کا قائم کردہ قانون یہ ہے کہ جو شخص اِس مطلوب کردار کو اختیار نہ کرے وہ خدا کی طرف سے سزا پائے گا اور جو شخص اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہوئے اس مطلوب کردار کا حامل بن جائے اس کو خدا کی طرف سے ابدی انعام کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ یہ امتیازی انعام اِس کائنات میں صرف انسان کے لیے مقدر ہے۔ کیوں کہ انسان خود اپنے اختیار سے وہ مطلوب روش اختیار کرتا ہے، جس کو بقیہ کائنات مجبورانہ طور پر اختیار کیے ہوئے ہے۔

آئی ڈنٹٹی کی تلاش

مَیں کون ہوں (who am I) ایک ایسا سوال ہے جو ہمیشہ سے انسان کی توجّہ کا مرکز رہا ہے۔ اِس سوال کو ایک لفظ میں آئی ڈنٹٹی کرائسس (identity crisis) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ افکار کی تاریخ (history of thought) بتاتی ہے کہ اِس معاملے میں انسانی دماغ سب سے زیادہ جس تصور سے مسحور رہا ہے وہ وحدتِ وجود (monism) کا تصور ہے۔ ہندوازم میں اس کو اُدوئت واد کہا جاتا ہے۔ اِس تصور کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک عظیم پھیلی ہوئی طاقت ہے اور انسان اسی طاقت کا ایک جُزء ہے۔

فلسفہ اور مذہب دونوں میں یہ نظریہ ہمیشہ چھایا رہا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان بھی بعد کے زمانے میں یہ نظریہ پھیل گیا۔ صوفیا میں خاص طور پر اور علماء میں عام طور پر اِس نظریے نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔ مثنوی مولانا روم، جس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوچکا ہے، اور جو نہ صرف صوفیا بلکہ علماء میں بھی مقدس کتاب کے طور پر پڑھی جاتی رہی ہے، وہ پوری کی پوری وحدتِ وجود کے تصور پر لکھی گئی ہے۔

اِس بات کو اردو شاعر نے اِس طرح بیان کیا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اصل یہ ہے کہ انسان جب پیدا ہوکر دنیا میں آتا ہے تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس سوال سے دوچار ہوتا ہے کہ میں کون ہوں، میں کہاں سے آیا ہوں، اور میری منزل کیا ہے۔

پانچ ہزار سال پہلے یونانی فلسفیوں نے آئی ڈنٹٹی کرائسس کے اِس سوال پر غور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے یہ فرض کیا کہ انسان ایک حقیقتِ کُلّی کا حصہ ہے۔ وہ صرف اس لیے اُس سے الگ ہوا ہے کہ ایک دن وہ دوبارہ اس سے مل جائے۔ انسان ایک الگ وجود کی حیثیت سے اپنی شناخت نہیں پارہا تھا۔ لیکن جب اس نے یہ مان لیا کہ وہ ایک عظیم تر حقیقتِ کلّی کا ذاتی جز ہے تو اس نے گویا اپنی

شناخت پالی۔ کائنات کے اندر اس کو اپنی پہچان معلوم ہوگئی۔ یہ نظریہ بہت بڑے پیمانے پر پھیلا۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کو مانزم اور ادوئت واد اور وحدتِ وجود کہا جاتا ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایک نامکمل وجود ہے۔ وہ اپنی تکمیل کے لیے اپنی ذات سے باہر کسی اور چیز کو چاہتا ہے۔ یہ احساس ہر انسان کو مسلسل طور پر بے چین رکھتا ہے۔ جب انسان کو اپنی اس تلاش کا جواب نہیں ملتا تو اس کا حال وہ ہو جاتا ہے جس کو سر جیمز جینز نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا— میں شاید بھٹک کر ایک ایسی دنیا میں آ گیا ہوں جو میرے لیے بنائی نہیں گئی۔ اِسی احساس کی ترجمانی ایک اردو شاعر نے اِس طرح کی ہے:

مجھے بلا کے یہاں، آپ چھپ گیا کوئی　　وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

I was invited here, but when I came the invitee was absent. I am the guest who failed to find his host.

میں نے وحدتِ وجود کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا۔ مگر میں نے پایا کہ اِس پورے نظریے کے پیچھے کوئی حقیقی دلیل موجود نہیں۔ یہ پورا نظریہ صرف تمثیلات پر کھڑا کیا گیا ہے، اور تمثیل کسی بھی درجے میں منطقی دلیل کے قائم مقام نہیں۔ مثال کے طور پر ہندوازم کو ماننے والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ سمندر کا ایک قطرہ سمندر سے باہر ہو تب بھی وہ سمندر کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ اِسی طرح انسان حقیقت کے سمندر کا ایک قطرہ ہے۔ جب تک وہ باہر ہے وہ ایک الگ قطرہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب وہ سمندر میں مل جائے تو اس کے بعد ایک الگ قطرے کی حیثیت سے اس کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ اسی بات کو مثنوی مولانا روم میں اِس طرح کہا گیا ہے:

بشنو از نَے حکایت می کُند　　از جدائی ہا شکایت می کند

اصل یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ ایک کنفیوژن کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ انسان کے اندر اپنی شناخت کے حوالے سے جو بحران (crisis) پایا جاتا رہا ہے وہ اِس لیے نہیں ہے کہ پانی کا قطرہ اپنے سمندر کی تلاش میں ہے، بلکہ وہ اِس لیے ہے کہ مخلوق اپنے خالق کو پہچاننا چاہتی ہے۔ اسی فرق کو نہ سمجھنے

کی وجہ سے وہ نظریات پیدا ہوئے جن کو مانزم یا اِس طرح کے دوسرے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

اِس معاملے پر قرآن کی روشنی میں غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان ربط اپنے آپ میں ایک فطری حقیقت ہے۔ لیکن اِس ربط کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پانی کا قطرہ سمندر میں مل کر ایک ہو جائے، بلکہ اس کا مطلب صرف قربت (nearness) ہے۔ انسان فطری طور پر اپنے اُس خدا کی قربت چاہتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا، اور جو اس کو سب کچھ دینے والا اور اس کو سنبھالنے والا ہے۔

اِس قربت کو ماں اور بیٹے کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ بیٹا اپنی ماں سے قریب ہونا چاہتا ہے۔ یہ بلاشبہہ اس کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ لیکن اس خواہش کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ماں اور بیٹا دونوں کی ذات ایک دوسرے میں مدغم ہو جائے، یہاں تک کہ بیٹے کا کوئی الگ وجود باقی نہ رہے۔ بیٹے کے اندر یہ خواہش سادہ طور پر صرف قربت کے معنیٰ میں ہے نہ کہ انضمام (merger) کے معنیٰ میں۔

قرآن میں خدا اور بندے کی دنیوی قربت کے معنی میں یہ آیت آئی ہے: **واسجد واقترب** (القلم)، اور آخرت میں خدا اور بندے کی قربت کا تصور اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے: **ربّ ابن لی عندک بیتاً في الجنّة** (التحریم ۱۱)

اِس بات کو دوسرے لفظوں میں اِس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی زندگی میں خدا اور بندے کے درمیان روحانی ہم سائیگی (spiritual neighbourhood) کا معاملہ پیش آتا ہے اور آخرت کی زندگی میں خدا اور بندے کے درمیان مادّی ہم سائیگی (physical neighbourhood) کا تجربہ ہوگا۔ جو کہ انسان کے لیے تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ثابت ہوگا۔

اس معاملے پر مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کر کے جس دنیا میں اس کو رکھا ہے وہ دنیا پورے معنوں میں اپنے خالق کا تعارف ہے۔ یہاں وسیع خلا ہے جو خالق کی ناقابلِ احاطہ ہستی کا گویا ایک تعارف ہے۔ یہاں روشن سورج اور روشن ستارے ہیں جو بتاتے ہیں کہ خالق کس طرح تمام موجودات کے لیے روشنی کا منبع ہے۔ یہاں اونچے پہاڑ ہیں جو خدا کی عظمت کا

ایک علامتی اظہار ہیں۔ یہاں پانی کے اتھاہ سمندر ہیں جو خدا کی بے پایاں رحمت کی داستان سنا رہے ہیں۔ یہاں سرسبز درخت ہیں جو یہ بتا رہے ہیں کہ خدا نے کس طرح ہماری زمین پر لائف سپورٹ سسٹم کا حیرت انگیز نظام قائم کر رکھا ہے، وغیرہ۔

انسان پیدائشی طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ وہ اپنے عجز کی تلافی کے لیے اپنے سے بڑی کسی ہستی کو پانا چاہتا ہے۔ اِسی فطری احساس کی توجیہہ کرنے کی کوشش میں وحدتِ وجود کی قسم کے فلسفے بنے۔ مگر اِس احساس کا صحیح جواب یہ ہے کہ انسان خدا کی معرفت حاصل کرے۔ وہ خدا کی تخلیق میں غور وفکر کر کے خدا کی جھلکیاں دیکھے۔ وہ خدا کو دریافت کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

قرآن کے مطابق، انسان کی زندگی کا ایک مختصر حصہ قبل از موت دورِ حیات میں رکھا گیا ہے، اور اس کا زیادہ بڑا حصہ بعد از موت دَور میں رکھا گیا ہے۔ اِن دونوں دوروں میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ مخلوق کو اپنے خالق کی قربت حاصل ہو جائے۔ یہ قربت، دنیا کی زندگی میں تصوّراتی قربت کی صورت میں حاصل ہوگی، اور آخرت کی زندگی میں حقیقی قربت کی صورت میں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی زندگی میں آدمی کو خدا رُخی زندگی حاصل ہو جائے اور آخرت میں اس کو خدا کے پڑوس میں رہنے کی سعادت ملے۔

ممبئی میں مولانا وحید الدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتہ پر دستیاب ہیں۔ ٹیلی فون پر آرڈر دے کر بھی کتابیں منگوائی جاسکتی ہیں:

ICRA (Islamic Centre for Research & Awareness)
3, Shantaram Patil Bldg. behind Firdaus Mithaiwala,
Near Andheri Station (W), Mumbai-400058
Tel. 26285223, Mob. 9821197534

لائف بیانڈ لائف

Life Beyond Life

کیا موت کے بعد آدمی دوبارہ زندہ رہتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ ہاں۔ موجودہ دنیا میں کسی بھی چیز کو ثابت کرنے کے لیے جس طرزِ استدلال کو معتبر سمجھا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرزِ استدلال سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ موت کسی کے لیے زندگی کا خاتمہ نہیں۔ ہر عورت اور مرد کی زندگی ابدی ہے۔ موت کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی ایک دورِ حیات سے نکل کر دوسرے دورِ حیات میں داخل ہو جاتا ہے۔

۱۔ علماء طبّ پہلے یہ خیال کرتے تھے کہ موت کا مطلب دل کی حرکت کا بند ہو جانا ہے۔ مگر اب یہ نظریہ رد کیا جا چکا ہے۔ اب یہ مانا جاتا ہے کہ کوئی آدمی اُس وقت مرتا ہے جب کہ اس کے برین کا فنکشن رُک جائے۔ اس واقعہ کو بتانے کے لیے فنکشن کا لفظ درست نہیں۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ برین کسی انسان کے لیے موجودہ دنیا میں اس کے سفر کا آخری اسٹیشن ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، جب انسان کے ساتھ وہ واقعہ پیش آتا ہے جس کو کلنکل موت (clinical death) کہا جاتا ہے تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے جسم سے روح نکل جاتی ہے، لیکن جہاں تک برین کا تعلق ہے، وہ بدستور ویسا ہی باقی رہتا ہے جیسا کہ وہ موت سے پہلے تھا۔ موت کے بعد برین کا ایک سیل (cell) بھی کم نہیں ہوتا۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ روح یا انسان کی شخصیت (personality) برین سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ وہ کسی بھی اعتبار سے برین کا حصہ نہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ مرنے والا انسان مر کر بظاہر ہمارے پاس سے چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے وجود کا کم از کم ایک حصہ دنیا میں باقی رہتا ہے۔ یہ اس شخص کی آواز ہے۔ اس کے مرنے کے بعد جب ہم کیسیٹ پر اس کی آواز سنتے ہیں تو ہم کسی شبہہ کے بغیر یہ جان لیتے ہیں کہ یہ آواز اُسی مرنے والے انسان کی آواز ہے۔

موت کے بعد کسی آدمی کی آواز کا ٹھیک اُسی طرح موجود رہنا، اِس بات کا کم از کم ایک جزئی ثبوت ہے کہ انسان کی ہستی ایک غیر فانی ہستی ہے۔ انسان کی شخصیت کا اگر ایک جز ثابت شدہ طور پر موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے تو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کی پوری ہستی بھی قابلِ اعادہ (repeatable) حالت میں باقی اور موجود ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ موت کے بعد کسی انسان کی آواز جو باقی رہتی ہے وہ صوتی لہروں (sound waves) کی شکل میں باقی رہتی ہے۔ جب کہ انسان ایک زندہ وجود ہے۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں۔ اس لیے کہ اس دنیا میں ہر چیز لہروں ہی کا ایک مجموعہ ہے۔ اس دنیا میں جو چیزیں ہیں ان کی آخری ہیئت لہروں پر مشتمل ہے۔ میٹریل ورلڈ کی ہر چیز اپنے آخری تجزیے میں الکٹران ہے، اور الکٹران کے بارے میں سائنس داں یہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اَمواج امکان (waves of probability) ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ پھر اگر اِس دنیا کی تمام چیزیں امواجِ امکان ہیں تو انسان کی شخصیت بھی اگر امواجِ امکان کی ایک صورت ہو تو اس کے وجود سے انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ حیاتیاتی سائنس بتاتی ہے کہ انسان کا وجود بے شمار چھوٹے چھوٹے سیل (cell) کا مجموعہ ہے۔ یہ سیل ہر وقت ٹوٹتے رہتے ہیں، اور نیا سیل پرانے سیل کی جگہ لیتا رہتا ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پورے جسم کے تمام سیل بدل جاتے ہیں۔ گویا کہ معروف موت سے پہلے بھی انسان کا جسم برابر مرتا رہتا ہے۔

جسم میں سیل کے بدلنے (replacement) کا یہ عمل برابر جاری رہتا ہے۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی انسان کا سابقہ جسم مکمل طور پر مر جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی کا حافظہ (memory) مستقل طور پر ایک حالت میں باقی رہتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب جسم پر بار بار موت واقع ہوتی ہے تو انسان کا حافظہ کہاں باقی رہتا ہے۔ اگر وہ جسم کے سیل پر موجود رہا ہو تو حافظے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ لیکن سیل کے فنا ہونے کے باوجود حافظے کا باقی رہنا، اِس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی شخصیت، جسم سے ماورا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ

معروف موت کے باوجود اپنے آپ کو باقی رکھتی ہے۔

۴۔ اس سلسلے میں آخری اہم بات یہ ہے کہ دنیا میں کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے جو طرزِ استدلال رائج ہے، اور جس معیار پر وضاحت کے بعد چیزیں ثابت شدہ مان لی جاتی ہیں، اسی معیار پر زندگی بعد موت کے ثبوت کا تقاضا بھی کیا جاسکتا ہے۔ کسی اور معیار پر زندگی بعد موت کے ثبوت کا تقاضا کرنا غیر علمی بات ہے۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زندگی بعد موت بھی اسی طرح ایک ثابت شدہ واقعہ ہے جس طرح زندگی قبل موت ایک ثابت شدہ واقعہ سمجھی جاتی ہے۔ خالص منطقی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

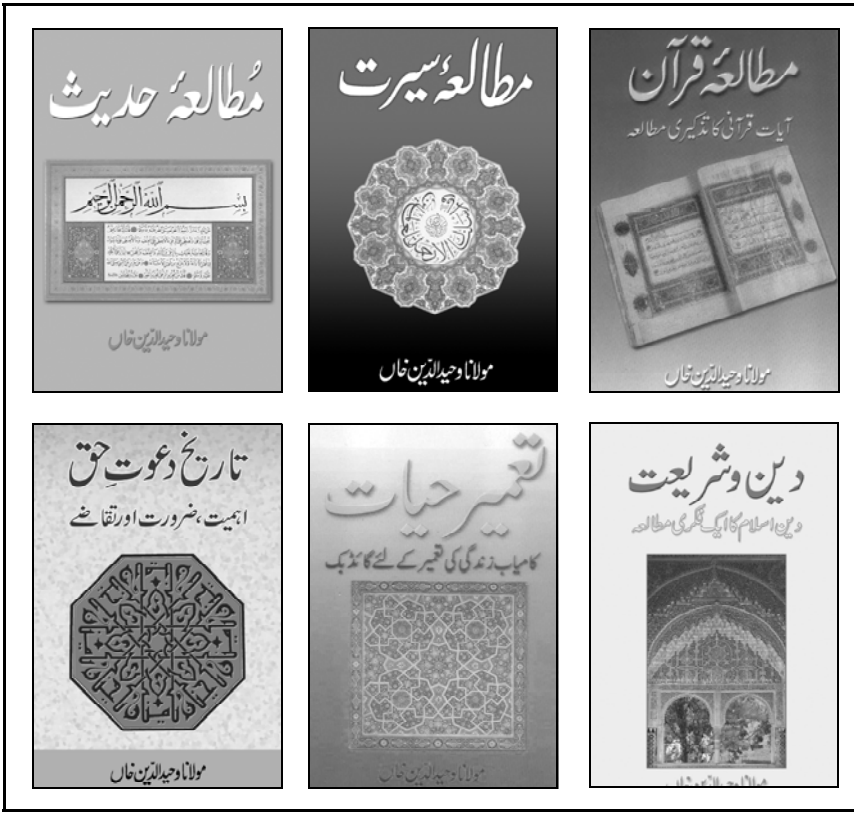

ڈائلاگ اسلام میں

ڈائلاگ (dialogue) یا مکالمہ دوشخصیتوں یا دو پارٹیوں کے درمیان بات چیت (conversation) کا نام ہے۔ ڈائلاگ کا مقصد یہ ہے کہ کسی اختلافی مسئلے کا پُر امن حل تلاش کیا جائے۔ قدیم بادشاہی دَور میں آزادانہ ڈائلاگ کا رواج نہ تھا۔ جب دنیا میں ڈیما کریسی آئی تو فطری طور پر لوگوں کے درمیان آزادانہ ڈائلاگ ہونے لگا۔ یہ ڈائلاگ سیاسی سطح پر بھی جاری ہوا، اور غیر سیاسی سطح پر بھی۔

ڈائلاگ دراصل انسانیت کو حیوانی دور سے اٹھا کر انسانی دور میں لانے کا نام ہے۔ انسانوں کے درمیان اختلاف ایک فطری چیز ہے۔ قدیم زمانے میں لوگ اختلاف کی باتوں پر لڑ جاتے تھے۔ وہ اختلاف کو طے کرنے کا ایک ہی طریقہ جانتے تھے، اور وہ لڑائی تھی۔ لیکن ڈیما کریسی نے اِس طریقے کو ختم کر دیا، اور انسان کو جنگل کلچر کے دور سے نکال کر امن کلچر کے دور میں پہنچایا۔

ڈائلاگ یا پُر امن مکالمے کا طریقہ عین اسلام کا طریقہ ہے۔ اسلام کی بنیاد دعوت کے اصول پر قائم ہے، اور دعوت پُر امن گفت وشنید کا دوسرا نام ہے۔ اسلام میں تشدد مکمل طور پر ایک ممنوع فعل ہے۔ اس ممانعت میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ دفاع کا ہے۔ یہ دفاع، خارجی حملے کے وقت ہوتا ہے۔ اور دفاع کا یہ کام بھی صرف باقاعدہ طور پر قائم شدہ حکومت کر سکتی ہے۔ غیر حکومتی تنظیم، دفاع یا انصاف کے نام پر متشددانہ لڑائی لڑنے کا حق نہیں رکھتی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶۱۰ عیسوی میں عرب میں اپنا مشن شروع کیا۔ یہ مشن کیا تھا۔ وہ مشن یہ تھا کہ آپ اپنی آئڈیالوجی کو لے کر لوگوں میں جائیں اور لوگوں سے اس کے بارے میں بات چیت کریں۔ ان کے اعتراضات کو سُنیں اور دلیل کے ذریعے اپنے نقطۂ نظر پر انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ پیغمبر اسلام پر جب وحی اترنا شروع ہوئی تو اس کے آغاز ہی میں آپ پر یہ آیت اتری: وأما بنعمة ربّک فحدث (الضحی: ۱۱) یعنی خدا کی طرف سے آپ کو جو نظریۂ حیات دیا گیا ہے،

لوگوں کے درمیان اس کا چرچا کریں۔ آپ کا نظریۂ حیات توحید پر مبنی تھا، جب کہ اُس وقت عرب کے لوگ شرک پر عقیدہ رکھتے تھے۔ اس لیے فطری طور پر آپ کا مشن دوطرفہ گفت وشنید کا موضوع بن گیا۔ آپ لوگوں سے اپنی بات کہتے اور لوگوں کا ردعمل سنتے اور پھر اس کی مزید وضاحت کرتے۔ اِس طرح آپ کا مشن عملاً وہی چیز بن گیا جس کو موجودہ زمانے میں ڈائلاگ کہا جاتا ہے۔

اِس ڈائلاگ کو مفید بنانے کے لیے قرآن میں کچھ بامعنیٰ اصول بتائے گیے ہیں۔ ان اصولوں میں سے کچھ اصولوں کا ہم یہاں تذکرہ کریں گے۔

۱۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت وہ ہے جس کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے: ''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بُلاؤ، اور اُن سے اچھے طریقے سے بحث کرو''۔ (النحل: ۱۲۵)

اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دوسروں سے تم جو گفتگو کرو وہ 'جِدال احسن' کے طریقے پر ہو۔ یعنی فریقِ ثانی سے تکرار نہ کرنا، بلکہ اس کے اختلاف کو سُن کر سنجیدگی کے ساتھ ایسی بات کہنا جو اس کے مائنڈ کو ایڈریس کرنے والی ہو۔ گفتگو محض بحث ومباحثے پر ختم نہ ہو بلکہ وہ ایک نتیجہ خیز انجام پر ختم ہو۔ بات چیت کے دوران حریفانہ اور رقیبانہ انداز اختیار نہ کیا جائے بلکہ علمی انداز اختیار کیا جائے۔

۲۔ اِس سلسلے میں دوسری آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور بھلائی اور بُرائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اُس سے بہتر ہو۔ پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا''۔ (حم السجدہ: ۳۴)

قرآن کی اِس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کوئی آدمی مسٹر دشمن نہیں۔ ہر آدمی امکانی طور پر مسٹر دوست ہے۔ اس لیے کہ ہر آدمی ایک ہی فطرت پر پیدا کیا گیا ہے، کئی فطرت پر نہیں۔ اِس قرآنی اصول سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈائلاگ کا آغاز اِس طرح نہیں ہونا چاہیے کہ پہلے ہی سے دونوں فریق ایک دوسرے کے بارے میں ناامید بنے ہوئے ہوں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ڈائلاگ کا عمل پُرامید ذہن کے ساتھ کیا جائے نہ کہ ناامیدی اور مایوسی کے ذہن کے ساتھ۔

۳۔ اِس سلسلے میں قرآن کی ایک اور آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''کہو، اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مسلّم ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں''۔ (آل عمران: ۶۴)

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو فریق کے درمیان بات چیت ہو تو اُس وقت موضوعِ گفتگو کا انتخاب کس طرح کرنا چاہیے۔ وہ یہ کہ گفتگو کا آغاز کنٹرورشل پہلو کو لے کر نہ کیا جائے بلکہ دونوں فریقوں کے درمیان کامن گراؤنڈ (کلمۂ سَواء) کی تلاش کی جائے، اور اِس کامن گراؤنڈ سے گفتگو کا آغاز کیا جائے۔ یعنی گفتگو کا طریقہ اختلاف سے اتفاق کی طرف نہ ہو بلکہ اتفاق سے اختلاف کی طرف ہو۔

۴۔ اِس سلسلے میں ایک اور قابلِ حوالہ آیت کا ترجمہ یہ ہے:

''اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو تم بُرا بھلا نہ کہو، ورنہ یہ لوگ حد سے گذر کر، جہالت کی بنا پر، خدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں گے''۔ (الانعام: ۱۰۹)

قرآن کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دو فریقوں کے درمیان ایک اختلافی موضوع پر ڈائلاگ ہو تو ضروری ہے کہ ڈائلاگ کے باہر موافقِ ڈائلاگ فضا کو باقی رکھا جائے۔ اگر ایسا ہو کہ دونوں فریقوں کا میڈیا ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی باتیں پھیلا رہا ہو۔ دونوں طرف کے لوگ ایسی باتوں کا چرچا کرنے میں مصروف ہوں جس سے ایک دوسرے کے خلاف معاندانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں تو ایسی غیر موافق فضا میں مفید ڈائلاگ نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈائلاگ کے نتیجہ خیز ہونے کا تعلق، صرف کمرۂ ڈائلاگ کی بات چیت پر منحصر نہیں ہوتا، بلکہ اِس پر منحصر ہوتا ہے کہ کمرۂ ڈائلاگ کے باہر جو فضا بنائی گئی ہے وہ ڈائلاگ کے حق میں ہے یا اس کے خلاف ہے۔

ڈائلاگ کا ایک اور اصول وہ ہے جو سنتِ رسول سے ثابت ہوتا ہے، یہ اصول حُدیبیہ کے معاہدے سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان لمبی بات چیت کے بعد طے پایا تھا۔ جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، یہ معاہدہ اِس طرح ممکن ہوا کہ پیغمبر اسلام نے قریش کی کئی

شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا۔ پیغمبر کی اِس سنت سے ڈائلاگ کا یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے نقطۂ نظر کو دلیل کے ساتھ پیش کریں۔ لیکن اِسی کے ساتھ دونوں اِس بات کے لیے تیار رہیں کہ ڈائلاگ ہمیشہ لینے اور دینے (give and take) کے اصول کو اختیار کرکے کامیاب ہوتا ہے نہ کہ صرف لینے کے اصول پر اصرار کرنے سے۔ عملی معاملات میں اسلام آخری حد تک لچک کے اصول کو پسند کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں صرف ڈائلاگ کے اصول نہیں بتائے گیے ہیں بلکہ ڈائلاگ کے اصول کا عملی تجربہ بھی بار بار کیا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اِس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

پیغمبر اسلام نے اپنے مشن کے مکّی دور میں بار بار ڈائلاگ کے اصول پر عمل کیا۔ مثلاً ایک بار قریش نے اپنے سردار عقبہ بن ربیعہ کو اپنا نمائندہ بنا کر پیغمبر اسلام کے پاس بھیجا۔ تاکہ باہمی اختلاف کے موضوع پر بات چیت کرکے صُلح کا ماحول بنایا جائے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عقبہ نے نہایت غور کے ساتھ آپ کی باتیں سنیں اور قریش کے پاس جا کر انھیں اِس سے آگاہ کیا۔ اِسی طرح ایک بار آپ کے چچا ابو طالب کی دعوت پر آپ اور قریش کے نمائندے اکھٹا ہوئے اور اختلافی موضوعات پر پُر امن انداز میں بات چیت ہوئی۔

اِسی طرح حدیبیہ کے موقع پر پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان ایک گفت وشنید ہوئی۔ اِس کا سلسلہ تقریباً دو ہفتے تک جاری رہا۔ اِس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان وہ معاہدۂ امن طے پایا جس کو معاہدۂ حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ واقعہ بلاشبہہ پُر امن ڈائلاگ کی ایک کامیاب مثال ہے۔

اِسی طرح پیغمبر اسلام کی موجودگی میں تین مذہب — اسلام، مسیحیت اور یہودیت کے نمائندوں کے درمیان ڈائلاگ ہوا۔ یہ ٹرائلاگ (trilogue) مدینہ کی مسجد نبوی میں ہوا۔ عرب مصنفین نے اس کو مؤتمر الادیان الثلاثه کا نام دیا ہے۔ یعنی تین مذہبوں کے درمیان ٹرائلاگ۔ غالباً یہ تاریخ کا پہلا ٹرائلاگ تھا جو مقدس عبادت خانے کے اندر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

اسلام میں پُرامن گفت وشنید کو کتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

اسلام کی تاریخ میں اِس طرح کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ یہ مثالیں اُس عہد زرّیں سے تعلق رکھتی ہیں جس کو عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے ڈائلاگ یا باہمی گفت وشنید کے اصول کو اسلام میں ایک مستند اصول کی حیثیت حاصل ہے۔

خلاصۂ کلام

اوپر کی گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام کا طریقہ پُرامن ڈائلاگ کا طریقہ ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صلح کا طریقہ سب سے بہتر طریقہ ہے۔ (النساء: ۱۲۸) اِس طرح ایک اور آیت میں آیا ہے کہ اختلاف کے موقع پر باہمی گفت وشنید اور ثالثی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ (النساء: ۳۵) حدیث میں آیا ہے کہ دشمن سے مڈبھیڑ نہ کرو بلکہ اللہ سے عافیت مانگو (**لاتتمنوا لقاء العدوّ وسئلوا اللہ العافیۃ**)۔

اسلام کا مقصد ربّانی انقلاب لانا ہے۔ لوگوں کو خدا پرستانہ زندگی کی طرف بلانا ہے۔ ایک ایسا سماج بنانا ہے جہاں روحانی اور اخلاقی اور انسانی قدروں کا رواج ہو۔ اسلام ایک ایسے ماحول کا داعی ہے جہاں امن اور ٹالرنس اور محبت اور خیر خواہانہ تعلقات کا مزاج لوگوں کے اندر پایا جائے۔ جہاں نزاعات کو تشدد کے بغیر حل کیا جائے۔ یہی اسلام کی مطلوب دنیا ہے۔ ایسی دنیا صرف پُرامن ڈائلاگ کے ذریعے ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام عقیدے کے اعتبار سے توحید پر قائم ہے، اور طریقِ کار کے اعتبار سے پُرامن ڈائلاگ پر۔ یہی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس کے سوا جو طریقہ ہے اس کو اسلام کا طریقہ نہیں کہا جاسکتا۔ (۲ جون ۲۰۰۶ء)

توہّماتی دَور سے سائنسی دَور تک

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ وہ عراق میں پیدا ہوئے۔ پھر مصر اور فلسطین سے سفر کرتے ہوئے وہ عرب کے اس مقام پر پہنچے جہاں اب مکہ آباد ہے۔ اُس وقت یہ مقام ایک غیر آباد مقام تھا۔ ریتیلے میدان اور خشک پہاڑوں کے سوا یہاں اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ یہاں انھوں نے اپنی اہلیہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو بسا دیا۔

یہ چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یہ کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ دراصل ایک نیا دورِ تاریخ شروع کرنے کا منصوبہ تھا۔ یہ منصوبہ اب مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے اپنی آخری تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔

اصل یہ ہے کہ چار ہزار سال پہلے کی دنیا میں ہر طرف شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل فطرت پرستی کا نام ہے۔ انسان، سورج، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ اور حیوانات، ہر چیز کو پوجتا تھا۔ وہ فطرت (nature) کو پرستش کی چیز بنائے ہوئے تھا۔

یہ صورت حال ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ خالق نے فطرت (nature) کے اندر ہر قسم کی طاقتیں چھپا دی تھیں۔ ضرورت تھی کہ انسان ان کو دریافت کرکے انھیں استعمال کرے۔ لیکن انسان نے فطرت کو پرستش کی چیز بنالیا۔ حتی کہ فطرت کی پرستش (nature worship) یا شرک، انسانی کلچر کا غالب حصہ بن گیا۔ پرستشِ فطرت کے اِس مزاج نے انسان کے اندر سے تسخیرِ فطرت کا ذہن ختم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فطرت کی طاقتوں کو دریافت کرکے، اس کو انسانی خدمت کے لیے استعمال کرنے کا ذہن عملاً ختم ہوگیا۔ اِس ماحول میں عابدِ فطرت پیدا ہونے لگے نہ کہ وہ لوگ جو کھُلے ذہن کے ساتھ تحقیق کرکے فطرت میں چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کرسکیں۔

ان حالات میں ضرورت تھی کہ ایک ایسی نسل پیدا کی جائے جو فطرت پرستی کے ذہن یا مشرکانہ تہذیب کے اثر سے خالی ہو۔ یہ کام کسی متمدن شہر میں نہیں ہوسکتا تھا۔ کیوں کہ اس زمانے میں ہر متمدّن شہر، شرک (فطرت پرستی) کا مرکز بن چکا تھا۔ اِس بنا پر حضرت ابراہیم نے مکّہ کے غیر آباد

علاقے کو منتخب کیا تا کہ یہاں کے کھلے ماحول میں ایک نئی نسل پیدا کی جائے جو مشرکانہ تہذیب کے اثرات سے خالی ہو، اور اپنے بے آمیز ذہن کی بنا پر نئی تاریخ بنانے کا کام کر سکے۔

پیغمبر اسلام اسی علاقے میں ۵۷۰ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ ۶۱۰ عیسوی میں آپ کو نبوت ملی۔ یہاں کی زندہ نسل جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے، اس میں کام کر کے آپ نے ایک طاقت ور ٹیم تیار کی۔ یہ ٹیم جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے اس نے غیر معمولی جدوجہد کے ذریعے قدیم دَور کے فطرت پرستانہ نظام (مشرکانہ نظام) کو توڑا، اور دوسرے دَورِ تاریخ کا آغاز کیا۔ یعنی وہ دَور جب کہ فطرت (nature) پرستش کے بجائے تسخیر کا موضوع بنے۔ یہ عمل ہزار سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ موجودہ دور پیدا ہوا، جب کہ فطرت کا آزادانہ مطالعہ کر کے فطرت میں چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دَور آ گیا جس کو سائنسی دَور یا جدید صنعتی دَور کہا جاتا ہے۔

اکیسویں صدی میں اب دنیا اپنی تاریخ کے تیسرے دَور میں پہنچ چکی ہے۔ اس دَور میں بیک وقت دو چیزیں پوری طرح ظاہر ہو چکی ہیں۔ ایک ہے، جدید مشینی سامانوں کے ذریعے نیے تمدنی اسباب کا پیدا ہونا۔ ان نیے تمدنی اسباب میں سب سے زیادہ اہم چیز جدید مواصلات (ماڈرن کمیونکیشن) ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ساری دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر اور پیغام رسانی اتنا ہی آسان بن چکا ہے جتنا کہ پہلے ایک محلے کے اندر ممکن ہوتا تھا۔

جدید انقلاب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خدائی سچائی آخری حد تک مُبرہن ہو چکی ہے۔ خدائی سچائی کے حق میں پہلے روایتی دلائل ہوا کرتے تھے۔ اب خدائی سچائی کو ثابت شدہ بنانے کے لیے سائنسی دلائل ظاہر ہو چکے ہیں۔ خدائی سچائی اب صرف ایک عقیدہ نہیں رہی بلکہ وہ سائنسی طور پر ایک ثابت شدہ واقعہ بن چکی ہے۔

یہ تیسرا دور لوگوں کو ایک نیے عمل کی دعوت دے رہا ہے۔ پہلے دور کا مطلوب کام نئی نسل بنانا تھا، وہ بنو اسماعیل کے ذریعے انجام پایا۔ دوسرے دور کا مطلوب کام ایک انقلاب لانا تھا، جس میں فطرت

(نیچر) پرستش کے بجائے تسخیر کا موضوع بن جائے۔ یہ کام اصحاب رسول کے ذریعہ واقعہ بنا۔ تیسرے دور کا مطلوب کام یہ ہے کہ اب اکیسویں صدی میں عزم و یقین سے بھرپور ایک گروہ اٹھے۔ وہ جدید وسائل اور جدید دلائل کو استعمال کرکے خدائی سچائی کو عالمی سطح پر آشکارا کردے، تاکہ خدا کے بندے خدا کی رحمت کے سایے میں جینے کی سعادت حاصل کرسکیں۔

شاید انسانی تاریخ کا یہی وہ آخری دَور ہے جس میں دعوتِ نبوت کو انجام دینے والوں کے لیے حدیث میں اخوانِ رسول کا لفظ آیا ہے۔ اصحابِ رسول نے روایتی دَور میں اظہارِ دین کا کام انجام دیا تھا، اب اخوانِ رسول سائنسی دَور میں اظہارِ دین کے اسی کام کو انجام دیں گے۔ حدیث میں اخوانِ رسول کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔

رویاتی دور میں اظہارِ دین، اور سائنسی دور میں اظہارِ دین کے درمیان کیا فرق ہے، اس کو راقم الحروف نے اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قدیم روایتی دور میں انسان کا جو فریم ورک تھا اس کے مطابق، گرہن کے بارے میں قابل فہم طور پر صرف یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں سائنسی فریم ورک کی روشنی میں اِس واقعے کو اور بھی زیادہ ایمان افروز انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ زمین اور سورج اور چاند تین مختلف سائز کے متحرک اَجرام ہیں۔ مگر وسیع خلا میں ان کو ایک ناقابلِ قیاس حساب کے ذریعے ایک سیدھ میں لایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں سورج گرہن اور چاند گرہن واقع ہوتا ہے:

It is a result of unimaginably well-calculated positioning of three different moving bodies in the vast space.

نئی منصوبہ بندی کی ضرورت

انیسویں صدی عیسوی میں یہ واقعہ ہوا کہ مغربی قومیں نئی قوتوں سے مسلّح ہوکر ابھریں، اور ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گئیں۔ یہ علاقہ وہی تھا جہاں مسلمان سیکڑوں سال سے حالتِ اقتدار میں رہ رہے تھے۔ مسلم دنیا کے رہنماؤں کے اندر اس صورت حال کے خلاف ردّعمل پیدا ہوا۔ تقریباً ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں اس ردّعمل کا اظہار ہونے لگا۔

یہ بات بے حد اہم ہے کہ اسی زمانے میں اِس سوال کو لے کر دو تحریکیں اٹھیں۔ ایک تحریک ۱۸۵۷ میں اٹھی۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ یہ تحریک مسلّح انقلاب پر یقین رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے یہ کوشش کی کہ اسلحے کی مدد سے انگریزوں کو ہندستان سے نکال دیں۔ اِس جنگ میں ہندو اور مسلمان، دونوں کا بہت زیادہ جانی اور مالی نقصان ہوا۔ لیکن یہ تحریک اپنے مقصد میں مکمل طور پر ناکام رہی۔

اِس مسلّح تحریک کے تقریباً ساٹھ سال بعد مہاتما گاندھی، سیاسی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوئے۔ ۱۹۱۹ء کے بعد وہ کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر بن گیے۔

مہاتما گاندھی نے ۱۹۱۹ میں یہ اعلان کیا کہ وہ ہنسا (تشدد) میں یقین نہیں رکھتے۔ چنانچہ وہ آزادی کی تحریک کو مکمل طور پر اَہنسا (عدم تشدّد) کے اصول پر چلائیں گے۔ یعنی وائلنٹ متھڈ (violent method) کے بجائے پیس فُل متھڈ (peaceful method) کے ذریعے۔

جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، انگریزی حکومت ۱۸۵۷ سے لے کر ۱۹۱۹ تک تحریکِ آزادی سے وابستہ لوگوں کو تشدد کے ذریعے کچلنے کی کوشش کرتی رہی۔ تحریک آزادی کے کارکنوں کا تشدد، انگریزوں کو یہ موقع دیتا رہا کہ وہ جوابی تشدد کے ذریعے اِس تحریک کو کچلنے کی کوشش کرتے رہیں۔ لیکن جب مہاتما گاندھی نے تشدد کا طریقہ ترک کر دیا تو گویا کہ انھوں نے انگریزی حکومت سے تشدد کا جواز چھین لیا۔

مہاتما گاندھی کی امن پالیسی کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے اس کا ایک اندازہ اِس واقعے سے ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے ایک انگریز کلکٹر نے اپنے برٹش سکریٹریٹ کو یہ میسیج بھیجا کہ — براہِ کرم، بذریعہ ٹیلی گرام یہ بتائیے کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کس طرح ہلاک کیا جائے:

Kindly, wire instructions how to kill a tiger non-violently.

جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، متشددانہ طریقِ کار کے مقابلے میں پُر امن طریقِ کار اتنا زیادہ کامیاب رہا کہ صرف ۲۵ سال کے بعد ۱۹۴۷ میں انڈیا آزاد ہوگیا۔ ساٹھ سال کی پُر تشدد جدوجہد، آزادی کے حصول میں ناکام ثابت ہوئی۔ مگر بیس سال کی پُر امن جدوجہد، آزادی کے حصول میں پوری طرح کامیاب رہی۔

برِّصغیر ہند میں پیش آنے والے یہ دونوں واقعات، مسلم نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے۔ یہ واقعات بتا رہے تھے کہ نوآبادیاتی دَور صرف سیاسی استیلاء کے ہم معنٰی نہیں ہے، اسی کے ساتھ وہ نیے عظیم تر امکانات بھی لے کر آیا ہے۔ اِن امکانات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اب نیے وسائل نے قدیم پُر تشدد طریقِ کار کے مقابلے میں پُر امن طریقِ کار کو زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ جو جنگ ہتھیاروں کی مدد سے جیتی نہیں جاسکتی تھی، اس کو امن کے ذرائع کی مدد سے شان دار طور پر جیت لیا جائے۔

یہ واقعہ ساری دنیا کے مسلم رہنماؤں کے لیے ایک چشم کُشا واقعے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر میرے علم کے مطابق، ساری مسلم دنیا میں کوئی ایک بھی قابلِ ذکر مسلم رہنما نہیں تھا جو اِس واقعے سے سبق لے اور اس کی روشنی میں اپنی ملّی جدوجہد کی نئی منصوبہ بندی کرے۔ ہر جگہ کی مسلم تحریکیں بدستور اُسی متشددانہ طریقِ کار پر چلتی رہیں جس پر وہ پہلے چلتی تھیں۔ اِس تاریخ پر اب ڈیڑھ سو سال گذر چکے ہیں، لیکن کسی بھی علاقے کے مسلمانوں میں کوئی حقیقی مثبت تبدیلی دکھائی نہیں دیتی۔

مزید اندوہ ناک بات یہ ہے کہ مسلمان اپنے ذاتی معاملات کو تو مصالحت اور ایڈجسٹ مینٹ کے اصول پر چلاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک قومی پالیسی کی بات ہے، ہر جگہ وہ تشدد اور انتہا پسندی کا

طریقہ استعمال کررہے ہیں — یہ دوعملی بلاشبہہ اُن کے لیے پہلے سے بھی زیادہ ہلاکت خیز ہے۔

اِس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ مسلمان ساری دنیا میں اپنی تحریکوں پر نظرثانی کریں۔ وہ نظری اعتبار سے اپنی سوچ کو بدلیں، اور عملی اعتبار سے اپنی تحریکوں کو متشددانہ طریقِ کار کے بجائے پُر امن طریقِ کار کے اصول پر چلائیں۔ موجودہ حالت میں مسلمانوں کے لیے اِس کے سوا کوئی اور انتخاب نہیں۔ یہاں میں مختصر طور پر بتاؤں گا کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کو اپنی نئی پالیسی کن خطوط پر بنانا چاہیے۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ واضح انداز میں اِس بات کا کھلا اعلان کیا جائے کہ انڈیا میں، اور دوسرے ملکوں میں مسلمانوں نے جو مسلّح تحریکیں شروع کیں، وہ ان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اِس اعتراف کے بعد یہ اعلان کیا جائے کہ تمام مسلّح تحریکوں کو بلاشرط یک طرفہ طور پر ختم کیا جاتا ہے۔ اِس قسم کا اعلان لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کو کوئی نیا نقطۂ آغاز ہی نہیں ملے گا۔

بدقسمتی سے اِس معاملے میں برعکس طریقہ اختیار کیا گیا۔ سلطان ٹیپو سے لے کر یاسر عرفات تک، پچھلے دوسو سال کے اندر جو ناکام لڑائیاں لڑی گئیں، اب تک ہمارے لکھنے اور بولنے والے ان کو گلوری فائی کرتے رہے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تباہی کے واقعات مسلمانوں کی نظر میں فخر کے واقعات بن گیے۔ اس کی ایک مثال ''علماء ہند کا شان دار ماضی'' نامی کتاب ہے۔ اِس طرح کی تحریریں ساری دنیا میں شائع کی گئیں۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان اپنی معکوس نتیجہ پیدا کرنے والی لڑائیوں پر نظرثانی نہ کرسکے۔ کیوں کہ فخر اور نظرثانی، دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

۲۔ ضرورت ہے کہ ہر جگہ تمام متشددانہ کارروائیوں کو یک لخت بند کرکے تعلیم کا کام شروع کیا جائے۔ خاص طور پر ماڈرن ایجوکیشن بہت ضروری ہے۔ مسلمانوں میں جب تک ماڈرن ایجوکیشن نہ آئے، وہ جدید مسائل کو سمجھ نہیں سکتے۔ اور جب مسائل کی نوعیت ہی معلوم نہ ہو تو ان کے حل کی کامیاب منصوبہ بندی کس طرح کی جاسکتی ہے۔

۳۔ مسلمان ساری دنیا میں جہاں جہاں زمین کے لیے لڑ رہے ہیں، اب وہ اِس معاملے

میں اسٹیٹس کوازم (statusquoism) کی پالیسی اختیار کرلیں۔یعنی حالتِ موجودہ کوعلیٰ حالہ تسلیم کرنا،اورغیرنزاعی دائرے میں موجودمواقع کوپُرامن طور پراستعمال کرنے کی کوشش کرنا۔

۴۔ اسی کے ساتھ ضروری ہے کہ مسلمان اُس کام کوکریں جس کواسلام میں دعوت الی اللہ کہا گیا ہے۔یعنی اسلام کے پیغام کوپُرامن طور پرغیرمسلم قوموں تک پہنچانا۔دعوت کا کام کوئی محدود کام نہیں،دعوت کا کام پوری زندگی کے لیے ایک انقلابی عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔مسلمانوں میں اگر دعوت کا کام زندہ ہوجائے تواس کے بعددوسرے بہت سے مثبت واقعات وجودمیں آئیں گے۔مثلاً مسلمانوں کے اندرعالمی نقطۂ نظرپیدا ہوگا۔ان کے روابط دوسری قوموں سے بہت زیادہ بڑھ جائیں گے۔ان کے اندرتعلیم کا گہرا جذبہ پیدا ہوگا۔وہ ایک متحرک قوم بن جائیں گے۔ان کے اندرمثبت سوچ،تعمیری ذہن،تحمّل،رواداری اورانسانی احترام جیسی اعلیٰ صفات پیدا ہوں گی۔

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہورہا ہے۔ایڈیشن کا نام دی اسپریچول میسیج (The Spiritual Message) ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے:

دی اسپریچول میسیج،فی کاپی -/15روپے،سالانہ -/165روپے۔

خط وکتابت کا پتہ ہے:

The Spiritual Message
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/ 2821 8609, Fax: 2823 6323
Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

مسلم ایمپاورمنٹ، یا سیلف ایمپاورمنٹ

۱۹۴۷ میں جب ہندستان آزاد ہوا تو مسلم سیاست کی نسبت سے جو سب سے بڑی غلطی ہوئی وہ یہ کہ ہندستان کے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی شخصیت یا تحریک نہیں اٹھی جو مسلمانوں میں اپنی ملّی تعمیر کے لیے صحت مند رجحان (healthy trend) قائم کرے۔ فوری ردّعمل کے تحت، ہر باریش اور بے ریش رہنما نے مسلم حقوق کے نام پر مطالبات کی مہم شروع کر دی۔ یہ ان لوگوں نے کیا جو ایک ایسے مذہب پر فخر کرتے تھے جس کی تعلیم یہ ہے کہ — دوسروں سے سوال نہ کرو بلکہ دوسروں کے لیے نفع بخش بن جاؤ، اس کے بعد تمہارے حقوق تم کو اپنے آپ مل جائیں گے۔

حال میں اِس قسم کے لوگوں کو اپنی بے نتیجہ مطالباتی مہم کو چلانے کے لیے ایک نیا خوب صورت لفظ مل گیا ہے، اور وہ مسلم ایمپاورمنٹ (Muslim Empowerment) ہے۔ ایمپاور یا ایمپاورمنٹ کا مطلب ہے اختیار دینا۔ کہا جاتا ہے:

Science empowers men to control natural forces more effectively.

مسلم ایمپاورمنٹ کا مطلب دوسرے لفظوں میں مسلم اَپ لفٹ (uplift) ہے، یعنی مسلمان جو مفروضہ طور پر ایک پچھڑی ہوئی کمیونٹی بن گیے ہیں، ان کو ایسے مواقع بہم پہنچانا کہ وہ اوپر اٹھیں اور دوسرے گروہوں کے برابر ہو جائیں۔ اِسی قسم کی تحریک عورتوں کے حوالے سے ویمن ایمپاورمنٹ (Women Empowerment) کے نام سے چل رہی ہے۔ وہاں بھی یہی تصور ہے کہ عورتیں سماجی زندگی میں مَردوں سے پیچھے ہوگئی ہیں۔ اب عورتوں کو ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جن کے ذریعہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مَردوں کے برابر ہو جائیں۔

میرے نزدیک مسلم ایمپاورمنٹ کی تحریک ایک لفظی کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلم حقوق کے لیے مطالبات کی مہم پچھلی نصف صدی کے دوران مسلسل چلائی گئی ہے۔ یہ مہم اس سے پہلے مسلمانوں کے ''اکابر'' کے ذریعے چلائی گئی۔ لیکن وہ مکمل طور پر ناکام رہی۔ اب یہ مہم مسلمانوں کے ''اصاغر'' کے

ذریعے چلائی جارہی ہے۔ ایسی حالت میں کیسے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اب وہ نتیجہ خیز ہوجائے گی۔

اس معاملے میں ناکامی کسی اتفاقی سبب سے نہیں ہوئی۔ اس کا سبب صرف ایک تھا، اور وہ یہ کہ یہ مطالباتی مہم، قانونِ فطرت کے خلاف تھی۔ اِس دنیا کے لیے فطرت کا اٹل قانون یہ ہے کہ — جو دے وہ پائے، اور جو نہ دے وہ پانے سے محروم رہے۔ فطرت کا یہی اصول قرآن کی اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے: وأمّا ما ینفع الناس فیمکث فی الأرض (الرعد: ۱۷) یعنی جو دوسروں کے لیے نفع بخش بنتا ہے اُسی کو اِس دنیا میں قیام اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا: ولا تسئلنَّ أحداً شیئاً وإنّ سقط سوطک (مسند احمد، جلد ۵، صفحہ ۱۸۱) اِس حدیث کو عام طور پر فضائل صحابہ میں شمار کیا جاتا ہے حالاں کہ اِس میں زندگی کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی اِس دنیا میں اگر کامیاب ہونا چاہتے ہو تو مانگنے کا مزاج اپنے اندر سے ختم کردو، اپنی ذاتی محنت کے بل پر اپنی زندگی کی تعمیر کرو۔

مسلم ایمپاورمنٹ کی بات کرنے والے لوگ دستورِ ہند کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری مطالباتی مہم جائز ہے۔ کیوں کہ دستورِ ہند میں ملک کے شہریوں اور اقلیتوں کو جو حقوق دیے گیے ہیں ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان حقوق کو عملاً ہمیں دے دیا جائے۔

یہ بات گریمر کے اعتبار سے صحیح ہے۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ سرتاسر غلط ہے۔ اِس ملک کا ہر آدمی جانتا ہے کہ دستورِ ہند، صرف ایک لفظی گُل دستہ ہے۔ بعض ٹکنکل دفعات کے سوا، اس میں لکھی ہوئی کوئی بات اب تک واقعہ نہیں بنی — دستورِ ہند کے مطابق، ملک کو فیرالکشن ملنا چاہیے، لیکن اب تک ملک اس سے محروم ہے۔ دستور کے مطابق، ملک کو دیانت دار ایڈمنسٹریشن ملنا چاہیے، لیکن ملک کو صرف ایک کرپٹ ایڈمنسٹریشن ملا ہے۔ دستور ہند کے مطابق، دستور کے نفاذ کے پندرہ سال کے اندر سارے ملک کو تعلیم یافتہ ہوجانا چاہیے تھا، لیکن اب تک یہ خواب پورا نہیں ہوا۔ دستور نے ہندی زبان کو ملک کی قومی زبان کا درجہ دیا تھا لیکن عملاً ملک کے اوپر انگریزی زبان کا راج ہے، وغیرہ۔

دستورِ ہند کی یہ ناکامی ایک معلوم اور مسلّم واقعہ ہے۔ ایسی حالت میں کس طرح ممکن ہے کہ دستورِ ہند ایک استثنائی معجزہ کے طور پر مسلمانوں کی خواہش کے مطابق، ان کے تمام حقوق کا پارسل انھیں رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعہ روانہ کردے۔

جیسا کہ معلوم ہے، ہندستان میں مسلمانوں کے علاوہ اور کئی ''اقلیتیں'' بستی ہیں۔ مثلاً عیسائی، پارسی، سکھ اور جَین وغیرہ۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقلیتوں کے حقوق پوری طرح محفوظ ہیں۔ عیسائی اِس ملک کے تعلیمی نظام پر چھائے ہوئے ہیں۔ پارسیوں نے اِس ملک میں اپنا انڈسٹریل ایمپائر بنالیا ہے۔ سکھوں کی تعداد صرف دو فیصد ہے لیکن عملاً وہ ملک کی تقریباً بیس فیصد اقتصادیات کو کنٹرول کررہے ہیں۔ جینی فرقہ اتنا زیادہ خوش حال فرقہ ہے کہ اس کو کسی سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں۔ اِن اقلیتوں نے یہ کامیابی خود اپنی جدوجہد کے ذریعہ حاصل کی ہے، وہ انھیں دستور کے عطیہ کے طور پر نہیں ملی۔

اِن مثالوں میں ایک اور مثال شامل کرلیجئے، اور وہ خود مسلمانوں کا وہ طبقہ ہے جو مسلمانوں کی محرومی کو لے کر اپنی تحریک چلا رہا ہے، اور مسلمانوں کو ایمپاور کرنا چاہتا ہے۔ قریب سے دیکھیے تو یہ لوگ اپنی ذات کے اعتبار سے خود پوری طرح ایمپاور ہو چکے ہیں۔ ان کو وہ تمام مادّی چیزیں حاصل ہیں جن کو دوسروں کے لیے فراہم کرنے کے نام پر وہ اپنی تحریکیں چلا رہے ہیں۔

ایسی حالت میں مسلم ایمپاورمنٹ کا نعرہ لگانے والوں کو چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو یہ بتائیں کہ اِس ملک کی دوسری اقلیتوں اور خود مسلم ایمپاورمنٹ کے لیڈروں نے کس طرح اِسی ملک میں اپنے تمام مطلوب مفادات حاصل کرلیے۔ انھیں چاہیے کہ مسلمانوں کو کامیابی کا یہ راز بتائیں تاکہ وہ اِس سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو کامیاب بنا سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم ایمپاورمنٹ کا اِشو، سیلف ایمپاورمنٹ کا اشو ہے۔ یعنی خود اپنی جدوجہد کے ذریعے اپنے آپ کو محرومی سے نکالنا اور اپنے آپ کو ترقی کے مقام تک پہنچانا۔ یہ سارا معاملہ داخلی جدوجہد کا ہے، نہ کہ خارجی مطالبات کا۔

قیادت ناکام، مسلمان کامیاب

۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہوا۔ اُس وقت یہاں کے مسلمان، غالباً بلا استثنا، یہ سمجھ رہے تھے کہ اِس ملک میں اب مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ اُس زمانے میں مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے جس قسم کی مایوس کُن باتیں کہہ رہے تھے اُس کی ایک علامتی مثال مسٹر خالد لطیف گابا (وفات ۱۹۸۱) کی انگریزی کتاب منفعل آوازیں (Passive Voices) ہے۔ اِس کتاب کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا کہ — انڈیا کے مسلمانوں کی حالت کا خلاصہ بتانے کے لیے صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اِس ملک میں منفعل آوازیں بن چکے ہیں:

It would be difficult to sum up the status and conditions of Muslims in India better in two words "Passive Voices".

یہ آزادی کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں مسلم قیادت کا عمومی اندازہ تھا۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ نتیجہ عملاً اس کے بالکل برعکس نکلا۔ آج ہندستان کے مسلمان اس ملک میں ہمیشہ سے زیادہ بہتر حالت میں ہیں، حتی کہ مغل دَور سے بھی زیادہ بہتر حالت میں۔ آج کے شہروں میں مسلمانوں کو جو مادّی سہولیات حاصل ہیں وہ مغل دور کے مسلمانوں کو بھی حاصل نہ تھیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے مسلمان موجودہ ستاون مسلم ملکوں سے بھی زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔ اس کی علامتی مثال یہ ہے کہ پاکستان کا مسلمان نیوکلیر سائنٹسٹ ڈاکٹر عبدالقدیر خاں قید کی زندگی گذار رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں انڈیا کا مسلمان نیوکلیر سائنٹسٹ ڈاکٹر عبدالکلام، ملک کی صدارت کے عہدے پر فائز ہے۔

اس طرح انڈیا کے حکیم عبدالحمید (وفات ۱۹۹۹) نے دہلی میں ہمدرد یونیورسٹی بنائی۔ اس کے بعد اپنی عمر طبعی کے مطابق، ان کی وفات ہوئی۔ اس کے برعکس، حکیم محمد سعید (وفات ۱۹۹۸) نے کراچی میں ہمدرد یونیورسٹی بنائی اور ان کے دفتر میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا، وغیرہ۔

موجودہ ہندستان میں مسلمانوں کی جو ترقی یافتہ حالت ہے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۹۶۷ میں جب میں دہلی آیا، اُس وقت دہلی میں یہ حالت تھی کہ جمعہ اور عیدین کے دن مسجد کے باہر کسی مسلمان کی کار دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آج یہ حالت ہے کہ آپ جس مسجد میں جمعہ اور عیدین کی نماز ادا کریں، وہاں آپ کو مسجد کے باہر مسلم کاروں کی لمبی قطاریں دکھائی دیں گی۔ میں ۱۹۸۳ میں نظام الدین ویسٹ (نئی دہلی) کی کالونی میں آیا۔ اُس وقت یہاں ہر طرف صرف ہندو دکھائی دیتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ کالونی کی بیش تر بلڈنگوں کو مسلمانوں نے بڑی بڑی قیمت دے کر خرید لیا ہے۔ یہاں کی سڑکوں پر رات، دن مسلمانوں کی کاریں دوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس معاملے کو ایک اور مثال سے سمجھیے۔ پروفیسر خورشید احمد (مقیم برطانیہ) نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدرآبادی (وفات ۲۰۰۲) کے بارے میں ان کے حالات بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میرے استفسار پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایک بار بتایا کہ ''میں دولتِ آصفیہ (حیدرآباد) کے پاسپورٹ پر یورپ آیا تھا۔ پھر (پولیس ایکشن کے بعد) میری غیرت نے قبول نہ کیا کہ بھارت کا پاسپورٹ حاصل کروں.....'' ان کی دینی حس اتنی بیدار تھی کہ حیدرآباد دکن سے یورپ جانے کے بعد مقبوضہ حیدرآباد دکن کبھی واپس نہ آئے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ اسلامک فاؤنڈیشن لسٹر کے پروگرام میں شریک ہوں، تو بڑے دُکھے دل سے کہا کہ میں اُس انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھنا پسند نہیں کرتا جس نے میرے آزاد ملک کو بھارت کی غلامی میں دے دیا۔ وہ کبھی برطانیہ نہ آئے''۔ (ماہ نامہ میثاق، لاہور، مئی ۲۰۰۳)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے احساسات جو حیدرآباد کے بارے میں تھے وہی ۱۹۴۷ کے بعد تمام مسلم قائدین کے احساسات تھے۔ لیکن عملاً یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ کے بعد حیدرآباد کے مسلمانوں نے غیر معمولی ترقی کی، ایسی ترقی جو انھیں سابق دولتِ آصفیہ کے زمانے میں بھی حاصل نہ تھی۔ میں نے حیدرآباد کو ۱۹۴۷ سے پہلے بھی دیکھا تھا، اور آج کے حیدرآباد کو بھی میں نے کئی بار بار دیکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت

ہے کہ آج حیدرآباد کے مسلمانوں نے اتنی زیادہ ترقی کی ہے جس کا تصور بھی ۱۹۴۷ سے پہلے کے مسلمان نہیں کر سکتے تھے۔

آج آپ حیدرآباد کے جس حصے میں جائیں وہاں آپ کو مسلمانوں کی شان دار دکانیں اور بڑے بڑے نوتعمیر رہائشی مکانات نظر آئیں گے۔ مسجدیں اور مدرسے اور مسلم ادارے اپنی شان دار بلڈنگوں کے ساتھ بتا رہے ہوں گے کہ نیے حیدرآباد میں مسلمانوں کو غیر معمولی ترقیاں حاصل ہوئی ہیں۔

یہی حال پورے ملک کا ہے۔ اوپر میں نے ملک کے دو بڑے شہروں کا ذکر کیا ہے۔ مشرقی یوپی میں میرا آبائی گاؤں ایک دور افتادہ گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے یہاں ترقی نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ مگر آج اِس گاؤں میں بجلی، ٹیلی فون اور سڑک جیسی چیزوں کی موجودگی بتا رہی ہے کہ اب یہ گاؤں بھی ملکی ترقی کے نقشے پر آچکا ہے۔ گاؤں میں شان دار مدرسہ اور شان دار اسکول قائم ہے۔ گاؤں میں ہر طرف پختہ مکانات نظر آتے ہیں، وغیرہ۔

یہی حالت آج پورے ملک میں مسلمانوں کی ہے۔ گاؤں سے لے کر شہر تک ہر جگہ مسلمان تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ وہ تجارت اور تعلیم اور دوسرے ترقیاتی شعبوں میں نمایاں طور پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو انڈیا کے ہر شہر اور ہر علاقے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اِس حقیقت کا انکار کرے تو اس سے آپ صرف ایک سوال کیجئے کہ — تمھارے اپنے خاندان کی معاشی حالت ۱۹۴۷ سے پہلے کیا تھی، اور اب کیا ہے۔ یقینی طور پر اس کا جواب یہ ہوگا کہ آج میرا خاندان ۱۹۴۷ کے مقابلے میں بہت زیادہ بہتر حالت میں ہے۔ پہلے اگر ہمارے گھر کے لوگ سائیکل نشیں تھے تو اب وہ کار نشیں ہو گیے ہیں، وغیرہ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندستان کے مسلم قائدین کے تمام مایوسانہ اندازوں کے سراسر خلاف، ہندستانی مسلمانوں کی حالت اتنی زیادہ بہتر کیسے ہوگئی۔ یہ کوئی پُراسرار معاملہ نہیں۔ یہ تمام تر زمانی تبدیلی کا معاملہ ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کا انڈیا، بنیادی طور پر، زرعی دَور میں تھا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کا انڈیا، بنیادی طور پر، صنعتی دور میں پہنچ چکا ہے۔ زرعی دور میں معاشی ذرائع صرف لینڈ لارڈ کے پاس ہوا

کرتے تھے۔ صنعتی دور نے معاشی ذرائع کو ڈی سنٹرلائز (de-centralize) کر دیا۔ اِسی زمانی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ آج معاشی اسباب تمام لوگوں کے لیے قابل حصول ہو گیے۔ اسبابِ معیشت کے اِس عمومی پھیلاؤ میں جس طرح دوسروں کو حصہ ملا، اُسی طرح مسلمانوں کو بھی اس میں حصہ ملا۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ ان کے اوپر ایسے لوگ قائد بن گیے جو زمانی بصیرت سے مکمل طور پر خالی تھے۔ اپنی بے بصیرتی کی بنا پر وہ صرف ماضی کو دیکھ سکے۔ انھیں زمانے کی اُن انقلابی تبدیلیوں کی خبر نہ ہو سکی جو دورِ جدید کو مکمل طور پر بدل دینے والی تھیں۔ مسلمانوں کے یہ بے بصیرت قائدین، مسلمانوں کو منفی خبریں بتاتے رہے۔ جب کہ عین اسی وقت زمانے کے اندر ہونے والا تاریخی عمل، پورے ملک اور پورے سماج کو ایک نیے ترقیاتی دور کی طرف لے جا رہا تھا، جہاں معاشی مواقع ہر ایک کے لیے کھُل جائیں، جہاں کوئی بھی شخص عمومی اقتصادی برسات میں حصہ پانے سے محروم نہ رہے۔

مسلمانوں کے نام نہاد قائدین، اپنی بے بصیرتی کی بنا پر منفی بولی بولتے رہے۔ دوسری طرف زمانی اسباب مسلمانوں کے لیے ترقی کے دروازے کھولتے رہے۔ یہی وہ دوطرفہ واقعہ ہے جس کا نتیجہ ہم آج اِس صورت میں دیکھ رہے ہیں کہ — مسلم قائدین مکمل طور پر ناکام ہیں، اور مسلم کمیونٹی مکمل طور پر کامیاب۔

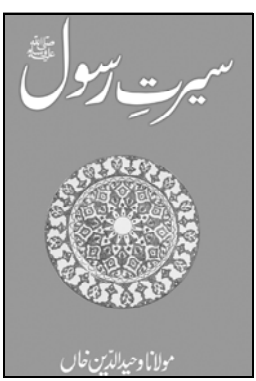

عارضی دورِ حیات، ابدی دورِ حیات

ایک طالب علم جب اپنی زندگی کے تعلیمی مرحلے میں ہوتو اُس کی سوچ اُس سے مختلف ہوتی ہے جب کہ وہ اپنی تعلیم کو مکمل کرکے اپنے لیے ایک اچھا جاب حاصل کرلے۔ پہلے مرحلے میں وہ اِس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ ایک مسافر ہے۔ جب کہ دوسرے مرحلے میں وہ اِس طرح رہتا ہے جیسے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہو۔ پہلے مرحلے میں وہ ہر چیز کو ایک وقتی چیز سمجھتا ہے۔ جب کہ دوسرے مرحلے میں وہ ہر چیز کو اِس حیثیت سے لیتا ہے جیسے کہ وہ اس کی زندگی کا مستقل حصہ ہو۔

یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں، انسانی زندگی کا ہے۔ انسان کو ہمیشہ کی عمر دی گئی ہے۔ اس عمر کے دو حصے ہیں، قبل ازموت، اور بعد ازموت۔ قبل ازموت، آدمی اپنے عارضی دَورِ حیات میں رہتا ہے۔ بعد ازموت وہ اپنے ابدی دَورِ حیات میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر یہ حقیقت آدمی کے اندر زندہ شعور کے طور پر موجود ہوتو یہی اس کی مکمل اصلاح کے لیے کافی ہوجائے۔

موجودہ دنیا کو مذہبی اصطلاح میں فتنے کی دنیا کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا ایک مغالطے کی دنیا (deceptive world) ہے۔ یہاں کی ہر چیز کسی نہ کسی اعتبار سے مغالطے کا رول (deceptive role) ادا کررہی ہے۔ یعنی موجودہ عارضی دنیا کو مستقل دنیا کے روپ میں دکھانا۔ موجودہ دنیا کی وقتی چیز کو مستقل چیز کی حیثیت سے متعارف کرنا۔ فانی بدایونی ایک اردو شاعر تھے۔ انھیں اپنی زندگی میں کچھ ایسے تجربات پیش آئے جس نے انھیں بتایا کہ موجودہ دنیا ایک بے حقیقت دنیا ہے۔ یہاں کی ہر خوش نُمائی صرف ظاہری اور وقتی خوش نمائی ہے۔ اپنے اِس تجربے کو انھوں نے اِن الفاظ میں نظم کیا تھا:

فریبِ جلوہ اور کتنا مکمل، اے معاذ اللہ! بڑی مشکل سے دل کو بزمِ عالم سے اٹھا پایا

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی ہر چیز مغالطہ آمیز ہے۔ وہ وقتی چیز کو مصنوعی طور پر ابدی رنگ میں دکھاتی ہے۔ کامیاب وہ ہے جو موجودہ دنیا کو عارضی دورِ حیات سمجھے، اور ناکام وہ ہے جو اِس دنیا کو ابدی دورِ حیات سمجھ لے۔

نعمت نہ کہ زحمت

زُہیر بن ابی سُلمیٰ (وفات: ۶۰۹ء) عرب جاہلیت کا مشہور شاعر تھا۔ ابن الاعرابی نے اس کے بارے میں کہا ہے: **كان لزُهير في الشعر ما لم يكن لغيره** (زہیر کا درجہ شعر میں وہ تھا جو کسی اور کو حاصل نہیں ہوا)۔ اس کا ایک قصیدہ سبع معلّقہ میں شامل کیا گیا۔ زہیر نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے کہ — میں زندگی کی مشقتوں سے اُکتا چکا ہوں، اور جو شخص اسی سال تک زندہ رہے گا، تیرے باپ کی قسم، وہ زندگی سے اکتا جائے گا:

سئمتُ تكاليف الحياة ومن يعش ثمانين حولاً لاأبا لكَ يسأم

میری عمر اب اسّی سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اپنے تجربے کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ لمبی عمر بلاشبہہ جسمانی اعتبار سے ایک بوجھ بن جاتی ہے۔ لیکن ذہنی اعتبار سے وہ کوئی بوجھ نہیں بلکہ وہ ایک نعمت ہوتی ہے۔ کیوں کہ زیادہ عمر کا مطلب ہے — زیادہ علم، زیادہ تجربہ، زیادہ معرفت اور زیادہ بصیرت۔ یہ چیز جو لمبی عمر میں ملتی ہے وہ کسی کو کم عمری میں حاصل نہیں ہوتی۔ آدمی اگر اس حقیقت کو سمجھے اور اپنے علم اور بصیرت کو مثبت طور پر استعمال کرے تو وہ نہ اُکتائے گا اور نہ مایوس ہوگا، بلکہ وہ نیے حوصلے کے ساتھ ازسرِ نو زندگی کا سفر شروع کر دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس آدمی کے اندر دو صفتیں ہوں۔ ایک، امکاناتِ فطرت کا شعور اور دوسرے، انسان کے ساتھ گہری خیر خواہی۔ جس آدمی کے اندر یہ دو چیزیں ہوں وہ برعکس طور پر یہ سوچے گا کہ آج دنیا کو دینے کے لیے میرے پاس ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ مجھے یہ کرنا چاہیے کہ میں اِس سرمایے کو تمام انسانوں کی امانت سمجھوں اور اس کو دوسروں تک پہنچانے میں اپنی بقیہ زندگی وقف کر دوں۔ زیادہ عمر ایک نعمت ہے، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

اِس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہر ناموافق میں ایک موافق پہلو چھپا ہوا ہے۔ بڑھاپا اگرچہ انسان کے لیے بظاہر ایک غیر مطلوب چیز ہے لیکن اس کے اندر ایک اعلیٰ درجے کی مطلوب چیز چھپی ہوئی ہے۔

دانش مند باپ

مختار الحسن رفیقی (پیدائش ۱۹۷۲) ایک ہونہار نوجوان ہیں۔ ان کی تعلیم جامعہ دارالسلام عمر آباد میں ہوئی۔ ان کے والد مولانا محمد رفیق قاسمی ۱۹۹۸ میں دہلی سے کویت جارہے تھے۔ اس وقت انھوں نے اپنا بایوڈاٹا ان کو دیا اور کہا کہ آپ کویت جارہے ہیں، وہاں کوشش کیجئے کہ مجھے کوئی جاب مل جائے۔ یہ بظاہر بیٹے اور باپ کا معاملہ تھا۔ باپ ہمیشہ بیٹے کے لیے نرم دل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بالکل برعکس واقعہ ہوا۔ باپ نے بیٹے کے بایوڈاٹا کو اس کے سامنے ہی پھاڑ کر پھینک دیا اور کہا کہ میں اس کو نہیں لے جاسکتا۔ آپ اپنے اندر ایسی صلاحیت پیدا کریں جس سے لوگ آپ کو بذات خود مدعو کریں۔

مختار الحسن رفیقی صاحب کو فطری طور پر اس واقعہ پر بہت غصہ آیا۔ وہ یہ سمجھے کہ میرے باپ کو مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کو میرے مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہے۔ لیکن یہ واقعہ دراصل ایک دانشمند باپ کا واقعہ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد یہ ہوا کہ مختار الحسن صاحب ہمیشہ سے زیادہ متحرک ہوگئے۔ ان کی صلاحیتیں اس جھٹکے کے بعد جاگ اٹھیں۔ انھوں نے بزنس کے میدان میں کام شروع کردیا۔ اب وہ خدا کے فضل سے ممبئی میں ایک کمپنی میں مینیجر ہیں اور ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

عام طور پر باپ کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے ساری سہولتیں فراہم کرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس دنیا میں نہ دینا بھی دینے کی ایک صورت ہے۔ جو باپ اپنے بیٹے کو کچھ نہ دے وہ اس کو زیادہ بڑی چیز دے دیتا ہے، اور وہ ہے خود کچھ کرنے کا جذبہ۔

اِس دنیا میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر عمل کا جذبہ جاگ اٹھے۔ اس کو کام کرنے کی دُھن لگ جائے۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ میں اپنے ہی کیے کا نتیجہ پاؤں گا۔ کسی اور سے مجھے کچھ ملنے والا نہیں۔ ایسا آدمی ایک بے پناہ آدمی بن جاتا ہے۔ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ یہاں تک کہ پہلے کا زیرو آج کا ہیرو بن جاتا ہے۔

دعوت کی تاریخ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل حیثیت یہ تھی کہ آپ حق کے داعی تھے۔ آپ کے بعد امتِ مسلمہ کی اصل ذمے داری بھی یہی ہے کہ وہ تمام قوموں تک اُس سچائی کو پہنچائے جو پیغمبر کے ذریعے اس کو ملی ہے۔ لیکن دعوت کا یہ کام اسلام کی تاریخ میں اپنے مطلوبہ انداز میں زیادہ نہ ہوسکا۔ دعوت کے اعتبار سے اسلام کی تاریخ کے تین دور ہیں:

۱۔ ایکٹیو دعوہ (active dawah)

۲۔ پَیسیو دعوہ (passive dawah)

۳۔ اینٹی دعوہ (anti dawah)

رسول اور اصحاب رسول کا زمانہ ایکٹیو دعوہ کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں براہِ راست طور پر دعوت الی اللہ کا کام کیا گیا۔ کسی بھی سیاسی یا غیر سیاسی آمیزش کے بغیر دعوت کا کام اس کی بے آمیز صورت میں انجام دیا گیا۔ یہ دعوت کے اعتبار سے اسلام کی تاریخ میں معیاری دور تھا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد وہ دور آیا جب کہ دعوت کا براہِ راست کام تقریباً ختم ہوگیا۔ لیکن دعوت کا کام بالواسطہ انداز میں اب بھی پوری طرح جاری رہا۔ اب قرآن محفوظ ہو چکا تھا۔ حدیث مدوّن ہوگئی تھی۔ ایک مسلم سماج بڑے پیمانے پر بن گیا تھا۔ مسلم ادارے منظّم کیے جا چکے تھے۔ عبادات کا نظام قائم ہوگیا تھا۔ اِس قسم کی چیزوں کے نتیجے میں یہ ہوا کہ دعوت کا کام خود اپنے زور پر برابر جاری رہا۔ اِس بعد کے زمانے میں اگرچہ مسلمان عملاً براہِ راست انداز میں دعوت کی مہم نہیں چلا رہے تھے، لیکن قائم شدہ ماحول کی بنا پر بالواسطہ انداز میں اسلام کا تعارف جاری تھا، اور اس کے نتیجے میں لوگ برابر اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی کو ہم نے پیسیو دعوہ کہا ہے۔ یہ کام مسلسل طور پر اٹھارہویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ اس کے بعد نوآبادیاتی نظام کے ظہور کی بنا پر اس کے اوپر روک لگ گئی۔

نوآبادیاتی نظام آٹھارہویں صدی میں مسلم دنیا میں داخل ہوا، اب مسلمانوں کے اندر

غیر مسلموں کے خلاف منفی ذہن پیدا ہوگیا۔ انھوں نے غیر مسلموں کے خلاف جگہ جگہ مسلّح جنگ چھیڑ دی۔ پورے مسلم سماج میں غیر مسلموں کے خلاف نفرت کا ماحول پیدا ہوگیا۔ یہ نفرت یا جنگ مدعو کے خلاف تھی۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کی طرف سے دعوت کے عمل کا خاتمہ کردیا۔ مدعو قوموں کے لیے مسلمانوں کے دل میں نُصح اور خیر خواہی کا جذبہ باقی نہیں رہا، وہ ان کو دشمن کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایسی حالت میں فطری طور پر دعوت کا کام جاری نہیں رہ سکا۔

رسول اور اصحاب رسول کے بعد مسلمان تقریباً ایک ہزار سال تک آپس میں لڑتے رہے۔ اِس لمبی مدت کا کوئی بھی لمحہ ایسا نہیں ہے جب کہ مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ کر آپس میں لڑائی نہ کررہے ہوں۔ یہ آپس کی لڑائی بلاشبہہ غلط تھی، لیکن وہ پیسیو دعوہ کے عمل کے جاری رہنے میں کوئی رکاوٹ نہ بن سکی۔

اینٹی دعوہ کا دَور جو اٹھارہویں صدی میں شروع ہوا، وہ دعوت کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا تھا۔ باہمی لڑائیوں میں مسلمان قتل ہوتے تھے، لیکن مدعو کے خلاف لڑائی میں دعوت کا قتلِ عام ہونے لگا۔ اِس عمل کے نتیجے میں فطری طور پر دعوت کے عمل کو سخت نقصان پہنچا۔ یہی تیسرا دور ہے جس کو ہم نے اوپر کی تقسیم میں اینٹی دعوہ کا نام دیا ہے۔

مسلمان جب تک آپس میں لڑ رہے تھے وہ خدا کی نظر میں صرف گنہ گار کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے مدعو قوموں سے لڑنا شروع کیا تو وہ خدا کے غضب کا نشانہ بن گیے۔ قرآن اور حدیث کے مطابق، وہ لعنت کے مستحق قرار پائے۔

یہ تیسرا دَور بے حد خطرناک دور ہے۔ یہی وہ دَور ہے جب کہ خدا نے مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کے حوالے کردیا۔ وہ ذلّت اور تباہی کے مستحق قرار پائے۔ دوسو سال سے بھی زیادہ مدّت سے مسلمانوں پر یہی دور گزر رہا ہے۔ عزت اور سرفرازی ان سے چھین لی گئی ہے۔ خدا نے انھیں ان کے دشمنوں کے حوالے کردیا ہے۔ یہ صورتِ حال صرف اُس وقت ختم ہوگی جب کہ مسلمان اپنی مجرمانہ روش کی بھیانک غلطی کا اعتراف کریں، وہ مدعو کے خلاف اپنی نفرت اور اپنے تشدد کو یک طرفہ طور پر ختم کردیں۔

سی پی ایس انٹرنیشنل

سَروے بتاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں تمام عورت اور مرد آئی ڈنٹٹی کرائسس کا کیس بنے ہوئے ہیں۔ اِس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر چھوٹے اور بڑے انسان کا یہ حال ہوا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایک کامیڈی کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا مگر موت نے بتایا کہ ہر ایک کے لیے صرف ٹریجڈی کا انجام مقدر تھا، ہر آدمی غیر حاصل شُدہ تمنّاؤں (unfulfilled desires) کا کیس بن کر رہ گیا۔ یہ بلا شبہہ انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ دردناک سوال ہے جس کا جواب شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام عورت اور مرد تلاش کر رہے ہیں، اِس میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہر عورت اور مرد شعوری یا غیر شعوری طور پر کچھ سوالات سے دوچار رہتے ہیں — میں کون ہوں۔ میری پیدائش کا مقصد کیا ہے۔ یہ دنیا کس منصوبے کے تحت بنائی گئی ہے۔ موت کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اس دنیا کے بارے میں خدا کا کریشن پلان کیا ہے۔ یہ سوالات آئڈیالوجی آف لائف سے تعلق رکھتے ہیں۔ سی پی ایس انٹرنیشنل کا مقصد انھیں سوالات کا جواب فراہم کرنا ہے۔

سی پی ایس انٹرنیشنل (Centre for Peace and Spirituality) گویا ایک اسٹڈی فورم ہے۔ سی پی ایس، لٹریچر، میڈیا، آڈیو اور ویڈیو کیسٹ اور ویب سائٹ کے ذریعے یہ کوشش کر رہا ہے کہ وہ پُر امن انداز میں سچائی کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔ سی پی ایس انٹرنیشنل گویا عالمی ڈائلاگ کا ایک اسٹیج ہے۔ وہ اِس لیے قائم کیا گیا ہے کہ لوگ اعلیٰ فکری سطح پر زندگی اور کائنات کے بارے میں ڈسکشن کریں اور اِس معاملے میں وہ کسی حتمی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ سی پی ایس انٹرنیشنل ایک خالص دعوتی تحریک ہے۔ سی پی ایس انٹرنیشنل کا تعلق، سیاست سے نہ براہِ راست طور پر ہے اور نہ بالواسطہ طور پر۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں سیاست ایک ثانوی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ اب سیاست کا تعلق صرف ایڈمنسٹریشن سے ہے۔ زندگی کے دوسرے تمام شعبے سیاست کے دائرۂ عمل سے باہر ہو چکے

ہیں، جب کہ قدیم زمانے میں ایسا نہ تھا۔

زندگی میں دو اہم شعبے ہیں۔ ایک ہے انتظامِ ملکی، اور دوسرا ہے انسان سازی۔ قدیم زرعی دَور میں یہ دونوں شعبے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ موجودہ صنعتی اور سائنسی دَور میں یہ دونوں شعبے عملاً ایک دوسرے سے الگ ہوچکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب حکومت کو انتظامیہ (administration) کہا جاتا ہے۔ اب اگر کسی کو حکومتی عہدہ مطلوب ہو تو اس کو سیاست میں جانا چاہیے۔ لیکن جو لوگ انسانی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہوں اُن کے لیے صحیح اور مفید طریقہ یہی ہے کہ وہ اقتدار سے باہر غیر سیاسی شعبوں کو اپنی جدوجہد کا نشانہ بنائیں۔

سی پی ایس انٹرنیشنل انسانی ترقی سے دل چسپی رکھتا ہے۔ اِس لیے اس نے صرف غیر سیاسی شعبے کو اپنا میدان کار بنایا ہے۔ مثلاً ایجوکیشن، فارمل اور انفارمل دونوں، اسپریچول ڈیولپ مینٹ، تعمیر شعور، امن کا فروغ، پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا، ویب سائٹ، میٹنگ اور ڈائلاگ، فکری رہنمائی اور ذہنی انقلاب، وغیرہ۔ یہی سی پی ایس کا اساسی مقصد ہے۔ ہمارا اصل کام فکری انقلاب لانا ہے۔ عملی انقلاب اِسی فکری انقلاب کا نتیجہ ہے۔ فکری انقلاب کے بغیر عملی نتائج پانا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

سی پی ایس انٹرنیشنل امن اور روحانیت کے ربّانی اصولوں پر قائم کیا گیا ہے۔ سی پی ایس کا پیغام یہ ہے کہ آؤ ہم امن اور روحانیت کے اصولوں میں اپنی مطلوب آئڈیالوجی آف لائف کو تلاش کریں۔ سی پی ایس کو یقین ہے کہ انسان، امن اور روحانیت کے ربّانی اصولوں میں اپنے اُن سوالات کا جواب پاسکتا ہے جن کا جواب پانے کے لیے وہ لمبی مدت سے ناکام طور پر سرگرداں ہے، اور پھر زیادہ بہتر بنیادوں پر وہ اپنی زندگی کی تعمیر وتشکیل کرسکتا ہے۔

امن کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے وہ عدم جنگ (absence of war) کا نام ہے۔ مگر یہ امن کی ایک ناقص تعبیر ہے۔ صحیح یہ ہے کہ امن ایک مکمل کلچر کا نام ہے۔ امن ایک اصول حیات ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عدم ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے زندگی کی تعمیر وتشکیل کی جائے۔ میدانِ

جنگ کے محدود دائرے سے باہر کی پوری زندگی امن کے دائرے میں داخل ہے۔

روحانیت کو عام طور پر ایک پُراسرار ڈسپلن سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روحانیت اِس سے زیادہ وسیع ہے۔ روحانیت دراصل، ربّانیت (divine cultrue) کا نام ہے۔ روحانیت کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔ روحانیت، دوسرے لفظوں میں، خدا رُخی زندگی (God-oriented life) کا نام ہے۔ روحانیت یہ ہے کہ آدمی اعلیٰ شعوری سطح پر سچائی کی معرفت حاصل کرے۔ فکری عمل کے ذریعے وہ اپنے اندر ربّانی شخصیت پیدا کرے۔ وہ سچائی کو ابدی حقیقت کی صورت میں دریافت کرے۔ وہ محدود مادّی دنیا سے اوپر اٹھ کر سچائی کو اس کی آفاقی صورت میں پالے۔ وہ زندگی کی معنویت کو دریافت کرکے پوری طرح ایک بامقصد انسان بن جائے۔

سی پی ایس انٹرنیشنل اپنے فکر کے اعتبار سے ایک آفاقی تحریک ہے اور اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ انسان فرینڈلی مزاج رکھتی ہے۔ سی پی ایس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے محدود دائرے سے اٹھ کر کائناتی کلچر کا حصہ بن جائے۔ وہ امن اور روحانیت اور حقیقت شناسی کی لامحدود دنیا میں جینے لگے۔

مونگیر (بہار) میں مولانا وحیدالدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں، ماہنامہ الرسالہ اُردو اور The Spiritual Message حسب ذیل پتے پر دستیاب ہیں:

Shah Imran Hasan
Anjuman Himayat-e-Islam
Muhalla: Dilawarpur, Kali Tazia Road
Distt. Munger, Bihar, Pin-811201

مساجد اور مدارس اور اداروں کے لیے مولانا وحیدالدین خاں کی دس کتابوں کا ایک منتخب سیٹ تیار کیا گیا ہے۔ خواہش مند حضرات آرڈر روانہ کرکے ۴۰ فی صد کی خصوصی رعایتی قیمت پر اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمہ ہوگا۔ نیز یہ آرڈر صرف ڈی۔ڈی کے ذریعے روانہ کیا جائے گا۔ ڈی۔ڈی Goodword Books (P) Ltd. کے نام سے ارسال کریں۔ جو حضرات کتابوں کا یہ منتخب سیٹ مساجد اور مدارس اور اداروں کو اپنی طرف سے ہدیہ کرنا چاہتے ہوں، وہ بھی اِس اسکیم میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ہر آرڈر کے ساتھ ماہ نامہ الرسالہ (اُردو) ایک سال کے لیے مفت جاری کیا جائے گا۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

سیٹ برائے مساجد	سیٹ برائے ادارہ اور مدارس
1 تذکیر القرآن (اُردو)	1 تذکیر القرآن (اُردو)
2 اللہ اکبر	2 اللہ اکبر
3 مطالعۂ قرآن	3 مطالعۂ سیرت
4 قال اللہ وقال الرسول	4 الاسلام
5 مطالعۂ حدیث	5 فکر اسلامی
6 مطالعۂ سیرت	6 دین وشریعت
7 سیرتِ رسول	7 تجدید دین
8 پیغمبر انقلاب	8 مذہب اور جدید چیلنج
9 عظمتِ اسلام	9 انسان کی منزل
10 انسان کی منزل	10 رازِ حیات
رعایتی قیمت صرف: -/570 Rs.	رعایتی قیمت صرف: -/510 Rs.

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 24355454, 24355729, email: info@goodwordbooks.com

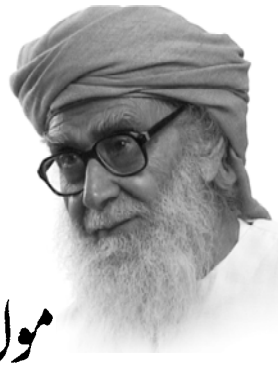

مولانا وحیدالدّین خاں

کے لکچرز، روزانہ

زی جاگرن ٹی وی چینل (Zee Jagaran) پر دیکھیں!

Programme: *Good Life*

Time: 7:20 am

نوٹ: اگر آپ کے یہاں زی جاگرن چینل نہیں آرہا ہے تو آپ اپنے کیبل آپریٹر کو درج ذیل تفصیلات دے کر مذکورہ چینل جاری کروائیں:

Satelite	: NSS6	Transponder	: KU Band
Polarization	: Vertical	Symbol Rate	: 40700
Down Linking Frequency	: 12534		

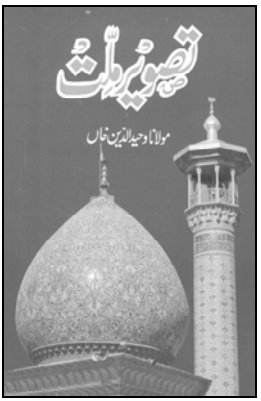
تصویرِ ملت
مولانا وحید الدین خاں

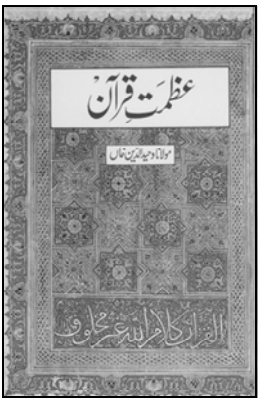
عظمتِ قرآن
مولانا وحید الدین خاں

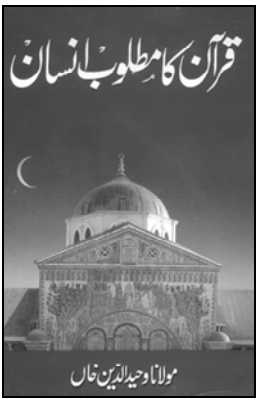
قرآن کا مطلوب انسان
مولانا وحید الدین خاں

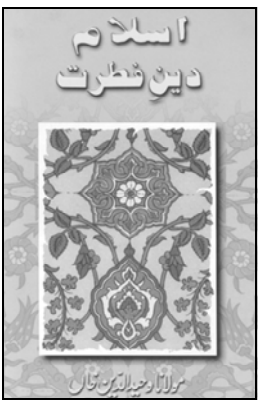
اسلام
دینِ فطرت
مولانا وحید الدین خاں

نشری تقریریں
مولانا وحید الدین خاں

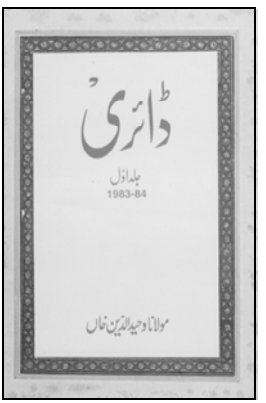
ڈائری
جلد اول
1983-84
مولانا وحید الدین خاں

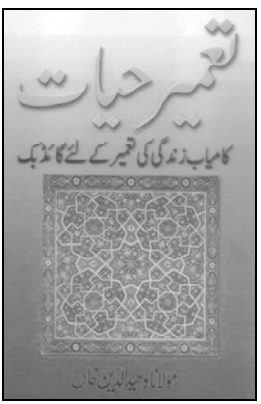
تعمیرِ حیات
کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے گائڈ بک
مولانا وحید الدین خاں

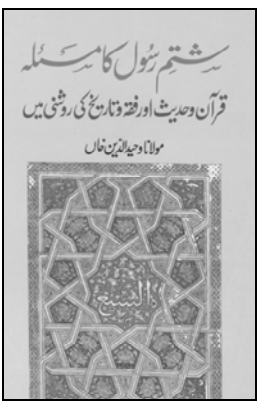
ختمِ رسول کا مسئلہ
قرآن وحدیث اور فقہ وتاریخ کی روشنی میں
مولانا وحید الدین خاں

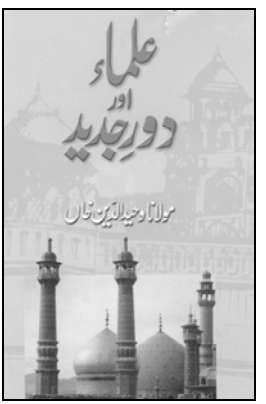
علماء
اور
دورِ جدید
مولانا وحید الدین خاں

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 100	$10/£5
دو سال	Rs. 200	$20/£10
تین سال	Rs. 300	$30/£15
پانچ سال	Rs. 480	$45/£20